قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ
مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا
أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَىٰ
طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ
آيَةً لِلنَّاسِ ۖ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا
لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ
أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ
أَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ
مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ
عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾

ع ۳۵ ۴

ترجمۂ آیات ۲۵۷-۲۶۰

اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے ہیں، وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف دھکیلتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخی ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۵۷۔

کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے باب میں اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا، جب کہ ابراہیم نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، وہ بولا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے

کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اسے پچھم سے نکال دے، تو وہ کافر یہ سن کر بھونچکا رہ گیا اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ۲۵۸

یا جیسے کہ وہ جس کا گزر ایک بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی، اس نے کہا کہ بھلا اللہ اس کو اس کے فنا ہو چکنے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اس کو سو سال کی موت دے دی، پھر اس کو اٹھایا۔ پوچھا کتنی مدت اس حال میں رہے؟ بولا ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ، فرمایا بلکہ تم پورے سو سال اس حال میں رہے۔ اب تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو، ان میں سے کوئی چیز بسی تک نہیں اور اپنے گدھے کو دیکھو، ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں تاکہ تمھیں اٹھائے جانے پر یقین ہو اور تاکہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور ہڈیوں کی طرف دیکھو، کس طرح ہم ان کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی وہ پکار اٹھا کہ میں مانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۵۹

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب، مجھے دکھا دے تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ فرمایا کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟ بولا ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا، تو چار پرندے لو اور ان کو اپنے سے ہلا لو، پھر ان کو ٹکڑے کر کے ہر پہاڑی پر ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ وہ تمھارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۲۶۰

۸۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓــُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۵۷)

ولی کا مفہوم ولی، کے معنی مددگار، کارساز، ساتھی اور حمایتی کے ہیں۔

نور اور ظلمت سے مراد اور ان کی فطرت نور سے مراد یہاں عقلی، ایمانی، عملی اور اخلاقی روشنی ہے۔ اسی طرح ظلمت سے یہاں مراد عقلی و اخلاقی ظلمت ہیں۔ چونکہ حق کی روشنی کا منبع ایک ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ، نیز حق میں انتشار نہیں بلکہ وحدت پائی جاتی ہے اس وجہ سے یہ لفظ واحد استعمال ہوا۔ برعکس اس کے ظلمت، جمع استعمال ہوا اس لیے کہ اس کے ظہور میں آنے کے راستے بھی مختلف ہیں اور اس کے مزاج میں انتشار و اختلاف بھی ہے۔

لفظ 'طاغوت' کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں اصلی نکتہ مطلب یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اصل اہمیت رکھنے والی شے یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کا دامن پکڑتا ہے یا کسی غیر کا۔ اگر خدا کا دامن پکڑتا ہے تو خدا اپنے بندے کا کارساز و مددگار بن جاتا ہے اور اپنی توفیق بخشی سے درجہ بدرجہ اسے نفس و شبہات کی تمام تاریکیوں اور کفر، شرک اور نفاق کی تمام ظلمات سے نکال کر ایمان کامل و توحید خالص کی شاہراہ پر لا کھڑا کرتا ہے اور اگر بندہ اپنے رب سے منہ موڑ کر کسی اور راہ پر جا نکلتا ہے تو پھر وہ شیطان اور اس کی ذریات کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور وہ اس کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے کر عقل و فطرت کی ہر روشنی سے دور کر کے اس کو ضلالت کے کھڈ میں گرا دیتے ہیں۔ مشہور مثل ہے "خانہ خالی را دیو میگیرد" جس گھر میں آدمی نہیں رہتا وہ شیطان کا مسکن بن جاتا ہے۔ اسی طرح جو دل ایمان سے خالی ہوتا ہے وہ شیطان کا اڈا بن جاتا ہے۔ اور پھر شیاطین ایسے شخص کو گمراہی کی وادیوں میں سرگشتہ و حیران رکھتے ہیں۔ سورۂ انعام میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓي اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۷۱ (کہہ دو کیا ہم اللہ کے سوا ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع پہنچاتے نہ نقصان اور اللہ کی ہدایت بخشی کے بعد پھر الٹے پیچھے پلٹا دیے جائیں، اس شخص کے مانند جس کو شیاطین نے بہکا کر کسی صحرا میں سرگشتہ و حیران چھوڑ دیا ہو) اعراف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۱۷۵ (اور ان کو اس کا ماجرا سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتوں سے نوازا تو وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہوں میں سے بن گیا)

یہی بات سورۂ زخرف میں بھی ارشاد ہوئی ہے۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۳۶ (جو لوگ اللہ کے ذکر سے بے پروا ہو جاتے ہیں، ہم ان پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں

اور وہ ان کا ساتھی بن جاتا ہے)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرٰهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرٰهِيمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ (۲۵۸)

"اَلَمْ تَرَ" کے خطاب کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔

"الذی" آیت ۲۵۸ میں کون مراد ہے

"اَلَّذِیْ" سے اگرچہ یہاں واضح نہیں ہے کہ کون مراد ہے لیکن ہمارے مفسرین نے اس سے عام طور پر نمرود کو مراد لیا ہے۔ یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کا ہم عصر بادشاہ تھا اور تالمود میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اس کا وہ مناظرہ بھی مذکور ہے جس کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔

اوتار بادشاہوں کا تصور

"فِیْ رَبِّہٖ" رب کے بارے میں بحث کی وجہ یہ ہوئی ہوگی کہ اس زمانے میں عام طور پر جو بادشاہ ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو اوتار بادشاہ (God Kings) کی حیثیت سے نمایاں کرتے تھے۔ یعنی ان کی قوم کے لوگ جن دیوتاؤں کو پوجتے تھے بادشاہ ان میں سے سب سے بڑے دیوتا کا مظہر سمجھا جاتا تھا، اس طرح بادشاہ کو بیک وقت سیاسی اور مذہبی دونوں قسم کا اقتدار حاصل ہو جاتا تھا۔ ہندوستان، چین اور مصر وغیرہ کے قدیم بادشاہوں میں سے اکثر کی حیثیت یہی تھی۔ نمرود کی قوم جن دیوتاؤں کو پوجتی تھی، قدیم صحیفوں اور قرآن دونوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سورج کو سب سے بڑے دیوتا کا درجہ حاصل تھا اس وجہ سے لازماً نمرود سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا رہا ہوگا۔ اس زعم کے ساتھ، ظاہر ہے کہ اپنی خدائی میں کسی اور خدا کی خدائی کی دعوت اس کے لیے ایک بالکل ناقابلِ برداشت چیز تھی۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اس بات کا اعلان کیا ہوگا کہ رب حقیقی صرف اللہ واحد ہی ہے، اس کے سوا کوئی رب نہیں تو اس دعوت کی زد اس نے اپنی خدائی پر بھی پڑتی محسوس کی ہوگی اور حضرت ابراہیمؑ کو بلا کر ان سے باز پرس کی ہوگی کہ یہ کون رب ہے جس کی تم دعوت دے رہے ہو، رب تو میں ہوں کہ سورج دیوتا کا مظہر اور اس کا اوتار ہوں۔

ضلالت کا سب سے بڑا سبب استکبار ہے

"اَنْ اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ" میں عربی زبان کے اسلوب کے مطابق "اَنْ" سے پہلے حرفِ جر محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس خدائی کے گھمنڈ میں وہ اس وجہ سے مبتلا ہوا کہ اللہ نے اس کو حکومت اور اقتدار بخشا۔ ہونا تو یہ تھا کہ اللہ کی بخشی ہوئی یہ نعمت پا کر وہ خدا کا شکرگزار اور فرمانبردار بندہ بنتا لیکن تنگ ظرفوں اور کم عقلوں کے لیے نعمت اکثر گمراہی کا باعث ہوئی ہے اور انھوں نے اس کو شکر کی جگہ کفر کا سبب بنایا ہے۔ جن لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے جب وہ اس اقتدار کو اللہ کے فضل و کرم کے بجائے اپنے استحقاق، اپنے علم اور اپنی تدبیر کا ثمرہ سمجھ بیٹھتے ہیں تو وہ اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ خدا یہ اقتدار بخش کر ان کا امتحان کر رہا ہے بلکہ وہ استکبار میں مبتلا ہو کر خود اپنی خدائی کا تخت بچھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے تدبیر یہ اختیار کرتے ہیں کہ خدا کے اوتار یا مظہر یا ظل اللہ کے روپ میں اپنے کو پیش کرتے ہیں۔

چنانچہ دولت و نعمت اور اقتدار کا گھمنڈ ہمیشہ ضلالت کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب رہا ہے۔ بہت کم خوش قسمت ایسے نکلے ہیں جو اپنے آپ کو اس فتنہ سے بچا سکے ہیں۔

حضراتِ انبیاء کا طریقِ بحث

نمرود کے سوال کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کی تعریف میں سب سے پہلے وہی بات کہی جو سب سے زیادہ واضح تھی۔ یعنی میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے۔ جو شخص بھی زندگی اور موت کے سوال پر غور کرتا ہے یہ سوال اس کو خدا کے ماننے پر مجبور کر دیتا ہے بشرطیکہ اس کے دماغ میں کوئی خلل نہ ہو لیکن نمرود کے ذہن میں اقتدار کا خناس سمایا ہوا تھا اس وجہ سے اس نے اس واضح حقیقت پر بھی یہ معارضہ کر دیا کہ موت اور زندگی پر اختیار تو میں بھی رکھتا ہوں، جس کا چاہوں سر قلم کردوں، جس کو چاہوں بخش دوں۔ ظاہر ہے کہ یہ معارضہ ایک بالکل ہی احمقانہ معارضہ تھا اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک بالکل ہی دوسری بات فرمائی تھی اور یہ ایک بالکل ہی دوسری بات تھی۔ حضرت ابراہیمؑ چاہتے تو دونوں باتوں کے درمیان جو فرق ہے اس کو واضح کر دیتے لیکن انھوں نے محسوس فرما لیا کہ ان کی واضح بات پر اس قسم کا احمقانہ معارضہ وہی کر سکتا ہے جو کٹ حجتی پر اتر آیا ہو اس وجہ سے انھوں نے اس کو مزید حجت کے لیے موقع دینا پسند نہیں فرمایا۔ انبیاء علیہم السلام مناظر نہیں بلکہ داعی ہوتے ہیں، اس وجہ سے انھوں نے خاص اس پہلو پر الجھنے کے بجائے اپنے رب کی ایک دوسری صفت بیان کر دی جس میں نمرود کے لیے کسی بحث کی راہ بالکل مسدود تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ اچھا، اگر یہ بات ہے تو میرا رب روز سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم ایک دن ذرا اس کو مغرب سے نکال کر دکھا دو۔ حجتِ ابراہیمی کا یہ وار ایسا بھرپور تھا کہ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ یہاں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خاص طور پر سورج کی تسخیر کا ذکر فرمایا جس کو نمرود کی نظر میں معبودِ اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور وہ اپنے آپ کو اسی معبودِ اعظم کا مظہر بنائے ہوئے بیٹھا تھا۔ بہترین استدلال اور لطیف ترین طنز کی یہ ایک نہایت خوب صورت مثال ہے۔

ہدایت و ضلالت کے معاملے میں سنت اللہ

آخر میں فرمایا کہ "اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں بخشا کرتا" یہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں بطور خلاصۂ بحث وہ اصول بیان ہوا ہے جس کو واضح کرنے ہی کے لیے اوپر والا واقعہ مذکور ہوا ہے۔ اس میں ظالم کا لفظ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بے جا استعمال کرتے ہیں، جو اللہ کے انعامات کو اس کا فضل قرار دینے کے بجائے ان کو اپنا حق سمجھتے ہیں، جو نعمتوں پر خدائے منعم کے شکر گزار ہونے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوتے اور ابلیس کی طرح اکڑتے ہیں، جو خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کی روش اختیار کرنے کے بجائے خود اپنی خدائی کے تخت بچھاتے اور اپنے کو رب ٹھہراتے ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ اس ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں ان پر ہدایت کی راہ نہیں کھلا کرتی۔ ایسے لوگوں کے سامنے حق کتنے ہی واضح طریقہ پر آئے وہ اس کو قبول کرنے کے بجائے بحث اور کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کو اس کی کوئی راہ ملتی نظر نہیں

آتی تو وہ نمرود کی طرح ہکے بکے اور ششدر ہو کر تو رہ جاتے ہیں لیکن حق کو قبول پھر بھی نہیں کرتے۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۵۹)

'اَوْ' کا محلِ استعمال

حرف 'اَوْ' اصلاً تقسیم کے لیے آیا کرتا ہے۔ پہلے ان لوگوں کی مثال پیش کی جن کا ذکر اوپر 'الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ' کے الفاظ سے فرمایا تھا، اب یہ ان لوگوں کی مثال بیان ہو رہی ہے جن کا ذکر 'اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ' سے فرمایا ہے۔

ایک بندۂ مومن جو طالبِ یقین تھا

اس تقسیم کی مثال اسی سورہ کی آیات ۱۷-۲۰ میں گزر چکی ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک صاحب کشاف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہاں جس شخص کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کافر تھا بلکہ یہ ایک ایسے بندۂ مومن کا ذکر معلوم ہوتا ہے جو ایمان سے تو بہرہ ور تھا لیکن وہ اپنے اس ایمان میں اس اطمینانِ قلب اور یقین کا طالب تھا جس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ اس کا یہ سوال کہ "اس بستی کو خدا اس طرح فنا ہو جانے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟" انکار کی نوعیت کا نہیں بلکہ اظہارِ حیرت کی نوعیت کا ہے۔ انسان بسا اوقات ایک چیز کو مانتا ہے اس لیے کہ عقل و فطرت اس کی گواہی دے رہی ہوتی ہے لیکن وہ بات بجائے خود ایسی حیران کن ہوتی ہے کہ اس سے متعلق دل میں بار بار یہ سوال ابھرتا رہتا ہے کہ یہ کیسے واقع ہو گی؟ یہ سوال انکار کے جذبہ سے نہیں بلکہ جستجوئے حقیقت کے جوش سے ابھرتا ہے اور خاص طور پر ان مواقع پر زیادہ زور سے ابھرتا ہے جب سامنے کوئی ایسا منظر آ جائے جو باطن کو جھنجھوڑ دینے والا ہو۔ یہ حالت ایمان کے منافی نہیں بلکہ اس ایمان کے مقتضیات میں سے ہے جس کی بنیاد عقل و بصیرت پر ہو۔ یہ سلوکِ باطن کی ایک ریاضت ہے جس سے ہر طالبِ حقیقت کو گزرنا پڑتا ہے اور یہ سفر برابر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ کے انوار سے قلب و نظر جگمگا نہ جائیں۔ اس سفر میں ہر منزل اگرچہ خوب سے خوب تر کی طرف اقدام کی نوعیت کی ہوتی ہے لیکن عارف کی نظر میں اس کا ہر آج اس کے گزشتہ کل سے اتنا زیادہ روشن ہوتا ہے کہ وہ کل اس کو آج کے مقابل میں شب نظر آتا ہے۔

'الذی' سے آیت ۲۵۹ میں کون مراد ہے؟

"الَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ" سے یہاں کس کی طرف اشارہ ہے؟ اس سوال کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ ارباب تفسیر میں سے کسی نے خضر کا نام لیا ہے، کسی نے عزیرؑ کا لیکن قدیم صحیفوں میں ان دونوں بزرگوں سے متعلق کوئی اس قسم کا واقعہ منقول نہیں ہے جس کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔ البتہ صحیفہ حزقی ایل میں اس سے ملتی جلتی ہوئی ایک چیز ملتی ہے جس کی نوعیت ایک مکاشفہ کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

حزقی ایل نبی کا ایک مکاشفہ

"خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے اپنی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے پُر تھی مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے پاس چوگرد پھرایا اور دیکھ وہ وادی کے میدان میں بکثرت اور نہایت سوکھی تھیں اور اس نے مجھے فرمایا اے آدم زاد، کیا یہ ہڈیاں زندہ ہو سکتی ہیں؟ میں نے جواب دیا، اے خداوند خدا تو ہی جانتا ہے، پھر اس نے مجھے فرمایا تو ان ہڈیوں پر نبوت کر اور ان سے کہہ اے سوکھی ہڈیو، خداوند کا کلام سنو۔ خداوند خدا ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ میں تمہارے اندر روح ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گی اور تم پر نسیں پھیلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تم کو چمڑا پہناؤں گا اور تم میں دم پھونکوں گا اور تم زندہ ہو گی اور جانو گی کہ میں خداوند ہوں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور جب میں نبوت کر رہا تھا تو ایک شور ہوا اور ایک زلزلہ آیا اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں، ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے۔ اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور ان پر چمڑے کی پوشش ہو گئی پر ان میں دم نہ تھا، تب اس نے مجھے فرمایا کہ تو نبوت کر، تو ہوا سے نبوت کر اے آدم زاد اور ہوا سے کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے دم تو چاروں طرف سے آ اور ان مقتولوں پر پھونک کہ زندہ ہو جائیں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور ان میں دم آیا اور وہ زندہ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئیں۔ ایک نہایت بڑا لشکر۔ (حزقی ایل باب ۳۷ : ۱-۱۱)

قرآن اور تورات کے اختلاف کی نوعیت

اگرچہ قرآن اور تورات کے بیان میں کچھ فرق ہے لیکن یہ فرق تضاد کی نوعیت کا نہیں بلکہ اجمال و تفصیل کی نوعیت کا ہے۔ اس طرح کا فرق بسا اوقات ایک ہی مقصد کی دو روایات میں پایا جاتا ہے جس کو تناقض پر نہیں بلکہ اجمال و تفصیل پر محمول کیا جاتا ہے۔ قرآن میں بعض باتیں زیادہ ہیں جو تورات میں نہیں ہیں۔ ایسے مواقع میں قرآن کے بیان کو ترجیح حاصل ہو گی اس لیے کہ وہ براہ راست خدا کا کلام اور بالکل محفوظ ہے۔ مثلاً تورات میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ خود حزقی ایل پر بھی سو سال کے لیے موت طاری کر دی گئی۔ اسی طرح ان کے کھانے کے نہ بُسنے اور گدھے کے دوبارہ زندہ ہونے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن ان کے ذکر نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ مشاہدات حزقی ایل کو نہیں ہوئے۔ جو مشاہدات ان کو کرائے گئے ان میں یہ بھی ہیں لیکن تورات میں یا تو ان کا ذکر نہیں ہوا یا ذکر تو ہوا لیکن اہل تورات نے اس کو ضائع کر دیا۔

آیات الٰہی کے مشاہدہ کے لیے سیر ملکوت

اگر قرآن کے اس حوالہ کا تعلق حزقی ایل نبی کے اسی مشاہدہ ملکوت سے مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ آیاتِ الٰہی کے مشاہدہ کے لیے اسی طرح کی ایک سیر ملکوت تھی جس طرح کی سیر ملکوت کی اس سے اعلیٰ مثال ہمارے یہاں واقعہ معراج ہے۔ یہ معاملات چونکہ ایک ایسے عالم میں پیش آتے ہیں جو ہمارے عالم کون و فساد کے ضابطوں اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماوریٰ ہے اس وجہ سے ایک کے احکام کو دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس عالم میں صدیوں اور قرنوں کے معاملات منٹوں

اور لمحوں میں انجام پاتے ہیں۔

"وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا" یہ گری ہوئی بستی کی تصویر ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ کہنہ عمارتیں جب گرتی ہیں تو ان کے انہدام کا آغاز ان کے کنگروں، میناروں اور ان کی چھتوں سے ہوتا ہے۔ پہلے بلندیاں پست ہوتی ہیں، اس کے بعد دیواروں کی باری آتی ہے۔

'اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ' کے سوال کی نوعیت

"اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا" یہ سوال، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، انکار کی نوعیت کا نہیں بلکہ حیرت و استعظام کی نوعیت کا ہے۔ اس سے مقصود حق الیقین کی طلب تھی اس وجہ سے یہ ایمان کے منافی نہیں بلکہ اس کے مدارج و مقامات میں سے ہے۔ یقین کے مختلف مدارج ہیں اس وجہ سے اس کی طلب ہر درجے کے اشخاص میں پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حضرات انبیاء بھی جو ایمان و یقین کے بلند ترین مدارج پر فائز ہوتے ہیں، اس سے مستغنی نہیں ہوتے بلکہ اس میں اضافہ کے لیے وہ بھی برابر دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے سوالات کے ابھرنے کا محل ایک طالبِ حقیقت کا اپنا ہی باطن ہوتا ہے۔ وہ یہ سوال دوسروں سے نہیں بلکہ خود اپنے ہی سے کرتا ہے اور اس کا جواب دوسروں سے نہیں بلکہ اس رہنمائے غیب سے چاہتا ہے جس کی تجلیات اس کے اپنے باطن کے افقِ اعلیٰ پر نمایاں ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، اسی نوعیت کی ایک خلش حزقی ایل بھی اپنے اندر محسوس فرماتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا مشاہدہ کرا کے ان کی یہ الجھن دور فرما دی اور اس طرح ان کو نہ صرف حیات بعد الموت کے معاملے میں اطمینانِ قلب کی ٹھنڈک حاصل ہو گئی بلکہ جیسا کہ آگے واضح ہو گا، احیائے بنی اسرائیل کی اس مہم کے لیے بھی ان کا دل پوری طرح مضبوط ہو گیا جس پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے تھے۔ یہ سنتِ الٰہی ہے کہ وہ ہدایت کے طالبوں پر اپنی راہیں کھولتا اور ان کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے ان کی تربیت فرماتا اور ان کو روشنی عطا کرتا ہے۔

"كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ" یہ سوال و جواب اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ آدمی کا جو زمانہ عالم برزخ میں گزرے گا، اٹھنے پر اس کا کوئی احساس باقی نہیں رہے گا، ایسا معلوم ہو گا کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ اٹھے ہیں۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی، پھر موت، پھر برزخ، پھر قیامت ایک بہت دور کی بات ہے، اس کے لیے ابھی سے اپنا عیش مکدر کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن جب قیامت کو اٹھیں گے تو معلوم ہو گا جو کچھ گزرا ہے وہ بہت دور کی بات نہیں بلکہ بالکل صبح و شام کا قصہ ہے۔

"وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ" یہاں "اُنْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ" کے بعد كَيْفَ نُحْيِيْهِ کے الفاظ محذوف ہیں۔ یعنی دیکھو کہ کس طرح ہم اس گدھے کو زندہ کیے دیتے ہیں۔ اس حذف کی وجہ یہ ہوئی کہ آگے زندہ کرنے سے زیادہ عجیب ماجرے، اس کی سڑی گلی ہڈیوں کو جوڑنے اور ان پر گوشت اور کھال

چڑھانے کی تفصیل آرہی ہے۔ اس مذکور کے اندر یہ محذوف آپ سے آپ موجود ہے۔

"وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ" میں حرف عطف کا وجود، درآنحالیکہ یہاں کوئی لفظ ایسا موجود نہیں ہے جو اس کا معطوف علیہ بن سکے، اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہاں معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ آگے جگہ جگہ اس کی وضاحت ہوگی۔ اس حذف کا فائدہ یہ ہے کہ الفاظ بہت کم استعمال ہوتے ہیں اور بات اس کے اندر بہت زیادہ سما سکتی ہے۔ اس لیے کہ ایسے مواقع میں وہ ساری بات حذف کی جا سکتی ہے جس پر سیاق و سباق دلیل بن سکے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ لِتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ اور اس معنی کے الفاظ محذوف ہیں۔ گویا پوری بات یوں ہوگی کہ "اور تم اپنے گدھے کو دیکھو کہ کس طرح ہم اس کو زندہ کیے دیتے ہیں تاکہ حیات بعد الممات پر تمہارا ایمان پکا ہو جائے اور تاکہ تمہیں ہم لوگوں کے لیے نشانی بنائیں۔ یہ نشانی بنانا چونکہ اس کا ایک بعید فائدہ تھا جس کی طرف آسانی سے ذہن منتقل نہیں ہو سکتا تھا اس وجہ سے اس کو ظاہر کر دیا اور ایمان بالبعث اس کا بالکل واضح اور قریبی فائدہ تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا اور حرف ربط کے ذریعہ سے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

بنی اسرائیل کے لیے پیغام حیات

"اور تاکہ ہم تم کو لوگوں کے لیے نشانی بنائیں" یعنی ہم نے تم کو آیاتِ الٰہی کا یہ مشاہدہ اس لیے بھی کرایا ہے کہ تم بنی اسرائیل کے لیے اس بات کی نشانی بن سکو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ وہ ان کو از سر نو غلامی و محکومی کی ذلت سے چھڑا کر آزادی اور قوت و عزت کی زندگی بخش دے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ حزقی ایل نبی منکروں کی طرف نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے اور ان کا خاص مقصد بنی اسرائیل کو از سر نو زندہ کرنا تھا لیکن تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بنی اسرائیل اپنے مستقبل کی طرف سے بہت مایوس تھے۔ چنانچہ اوپر ہم نے صحیفہ حزقی ایل کی جو عبارت نقل کی ہے اس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

> "تب اس نے مجھے فرمایا اے آدم زاد یہ ہڈیاں تمام بنی اسرائیل ہیں، دیکھ یہ کہتے ہیں، ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہو گئے اس لیے تو نبوت کر اور ان سے کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے میرے لوگو، دیکھو میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو ان سے باہر نکالوں گا تب تم جانو گے کہ خداوند میں ہوں اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گے اور میں تم کو تمہارے ملک میں بساؤں گا تب تم جانو گے کہ میں خداوند نے فرمایا۔" حزقی ایل باب ۳۷۔ ۱۱۔۱۴

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حزقی ایل نبی کو ان آیات کا مشاہدہ کرانے سے مقصود ایک تو یہ تھا کہ موت کے بعد زندگی کے مسئلہ میں خود ان کو شرح صدر حاصل ہو جائے، دوسرا یہ کہ ان کا یہ مشاہدہ بنی اسرائیل کے لیے پیغام حیات کا کام دے اور ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ انھیں بھی دوبارہ ایک زندہ قوم بنانے پر قادر ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہاں کھانے پینے کی چیزوں سے متعلق تو فرمایا کہ لَمْ يَتَسَنَّهْ (ان میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا)، برعکس اس کے گدھے کی ہر چیز سڑ گل گئی۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ایک ہی طرح کے حالات میں یہ دو مختلف اثرات کیوں نمایاں ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ طالب کی جو اصلی ذہنی خلش تھی وہ یہی تھی کہ ایک چیز مر کھپ جانے اور مٹی میں مل جانے کے بعد از سر نو زندگی کس طرح حاصل کرے گی؟ اس مشاہدے نے اس کی یہ خلش دور کر دی۔ ساتھ ہی کھانے پینے کی چیزوں کا کوئی تغیر نہ قبول کرنا اس کے لیے اس بات کا ثبوت بن گیا کہ اصل شئی اللہ کا حکم ہے، اگر اللہ چاہے تو کسی ایک شئے کو اس کے گل سڑ جانے کے بعد بھی از سر نو زندگی بخش سکتا ہے اور اگر چاہے تو کسی شئے کو تمام قوانین طبعی کے عمل سے بالاتر بھی رکھ سکتا ہے۔ قرآن میں اصحاب الکہف کا جو واقعہ مذکور ہے وہ اس کی مثال ہے۔

آخر میں فرمایا کہ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ یعنی اس مشاہدے کے بعد جب ان پر حیات بعد الممات کا راز بے نقاب ہو گیا تو وہ پکار اٹھے کہ اب میں مانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہاں أَعْلَمُ کا لفظ اپنے کامل معنی میں ہے۔ یعنی وہ جاننا جس کو قرآن نے علم الیقین سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ علم الیقین ان کو قیامت سے متعلق بھی حاصل ہو گیا اور بنی اسرائیل کے مستقبل کے باب میں بھی۔ گویا اس پردے میں انھوں نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہڈیوں میں زندگی پیدا ہوتے اور ان پر گوشت پوست چڑھتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اپنے مشن کی کامیابی پر انھیں پورا اعتماد ہو گیا۔ اس پہلو سے وہ اپنی قوم کے لیے ایک نشانی ٹھہرائے گئے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۶۰)

لفظ اطمینان کی حقیقت

'اطمینان' کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ٹھیک اس طرح ٹک جانا کہ اس کے ادھر یا ادھر جھکنے یا لڑھکنے کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ برتن اگر اپنی جگہ پر ٹھیک جم کر بیٹھ گیا ہے تو کہیں گے اطمأنّ اگر چراغ کی لو بالکل سیدھی ہے، اس میں ہوا کے سبب سے کسی طرف کو جھکاؤ نہیں ہے تو اس کے لیے بھی یہی لفظ لائیں گے۔ یہیں سے یہ لفظ نفس یا دل کی حالت کی تعبیر کے لیے استعمال ہونے لگا۔ جو نفس اپنے عقائد اور اعمال میں بالکل پابرجا ہے، حالات کے تغیر و تلوّن سے اس کے اطمینان اور اس کی دلجمعی میں کوئی فرق واقع نہ ہو، اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ یہ اطمینان ایمان کے اعلیٰ مدارج میں سے ہے۔ قرآن مجید میں اس کو شرح صدر کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (کیا ہم نے تمھارے سینے کو کھول نہیں دیا؟) سلوک باطن کے مدارج و مقامات درجہ بدرجہ طے ہوتے ہیں اس وجہ سے سیر باطن کے ایک دور میں حضرات انبیا بھی اس مقام کے طالب رہتے ہیں حالانکہ

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے وہ اس سے روزِ اوّل سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ یہ طلب ایمان کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ اس کی تکمیل ہے:

فَصُرْهُنَّ کی تحقیق

"صَوْرٌ" کے معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ صُرْتُ الشَّيْءَ یا اَصَرْتُ الشَّيْءَ کے معنی ہوں گے میں نے اس کو اپنی طرف مائل کر لیا، جھکا لیا، اپنے سے اس کو ہلا لیا۔ اسی سے فَصُرْهُنَّ ہے۔ یعنی ان پرندوں کو اپنے سے ہلا لو۔

حضرت ابراہیمؑ کی درخواست شرح صدر کے لیے تھی

جس طرح اوپر والے واقعے میں ایک بندۂ مؤمن نے اپنی ایک باطنی خلش کا اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار کیا تو اس نے اس کے لیے اپنی ملکوت کا ایک گوشہ بے نقاب کر کے اس کی خلش دور فرما دی اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے سلوک باطن کے ایک دور میں (یہ دَور ان کی زندگی کا ابتدائی دور ہی ہو سکتا ہے) اس بات کی خواہش کی کہ ان کو مشاہدہ کرا دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حشر کے وقت مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ یہ خواہش اسی طرح کی ایک خواہش ہے جس طرح کی خواہش حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لیے پیدا ہوئی۔ اس خواہش کی وجہ یہ نہیں تھی کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قیامت کا اعتقاد نہیں تھا، اعتقاد تو تھا، لیکن ایک حقیقت عقل کے نزدیک کتنی ہی واضح اور مدلل کیوں نہ ہو جب تک وہ نادیدہ ہوتی ہے اس وقت تک اس کو ماننے کے باوجود انسان اس کے باب میں شرح صدر کا آرزومند ہی رہتا ہے۔ یہ آرزو انبیاء کی شان کے خلاف نہیں ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن میں یہ دعا سکھائی گئی کہ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (دعا کرتے رہو کہ اے رب میرے علم کو بڑھا) یہ تشنگی تو اسی وقت دور ہو سکے گی جب اسباب کے تمام پردے بیچ سے ہٹا دیے جائیں گے اور اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے گی۔ لیکن یہ چیز اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں حاصل ہو گی۔ البتہ جہاں تک اطمینانِ قلب اور شرح صدر کا تعلق ہے اس سے وہ اپنے ان بندوں کو محروم نہیں رکھتا جو صدق دل سے اس کے طالب ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس مقصد کے لیے اگر اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے تو وہ اپنے خاص بندوں کو اپنی قدرت کے بعض مخصوص گوشوں کا بھی مشاہدہ کرا دیتا ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے فضل خاص کی دلیل ہے۔ وہ اپنے اوپر ایمان رکھنے والوں کا مددگار اور ولی ہے وہ ان کو کبھی حیرانگی و تشنگی میں نہیں چھوڑتا بلکہ ان کو ہمیشہ تاریکی سے روشنی اور اضطراب سے اطمینان کی طرف بڑھاتا رہتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے اضطراب کو دور کرنے کے لیے ان کو یہ ہدایت ہوئی کہ چار پرندے لے کر ان کو پہلے اپنے سے ہلا لو، پھر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے گوشت کا ایک ایک حصہ اپنے گرد و پیش کی پہاڑیوں پر رکھ دو۔ پھر ان کو اپنی طرف بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آ جائیں گے۔

چار پرندوں کی ہدایت اس لیے ہوئی ہو گی کہ چاروں سمتوں سے ان کے مجتمع ہونے کا ان کو مشاہدہ کرایا جائے تاکہ اس بات پر ان کا یقین مستحکم ہو جائے کہ قیامت کے دن اسی طرح نفخ صور پر تمام مخلوق ہر سمت

سے اپنے پروردگار کی طرف دوڑے گی۔

اپنے سے ہلا لینے کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی ہوگی کہ ان کو وہ اچھی طرح پہچان رکھیں تاکہ ان کو اس امر میں کوئی اشتباہ نہ پیش آئے کہ جو پرندے زندہ ہو کر آئے ہیں وہی ہیں جن کو انھوں نے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا، دوسرے نہیں ہیں۔ نیز یہ حقیقت بھی ان پر واضح ہو جائے کہ دوبارہ جو زندگی ہوگی اس میں دنیوی زندگی کی ساری یادداشتیں بھی زندہ ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ مانوس پرندے اپنے مالکوں کی آواز بھی پہچانتے ہوں گے۔

اگرچہ یہاں پرندوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے معنی کے لیے کوئی خاص لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن اس سے یہ معنی لینے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اول تو یہاں "جزءًا" کا جو لفظ آیا ہے وہ واضح قرینہ اسی بات کا ہے کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہی پہاڑوں پر ڈالنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ اگر ایک ایک پرندے کو زندہ الگ الگ پہاڑ پر رکھوا دینا مقصود ہوتا تو اس مفہوم کے لیے زبان کا یہ اسلوب صحیح نہیں ہے۔ عربی میں اس معنی کو ادا کرنے کے لیے اسلوب اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو تردد مردوں کے زندہ ہونے کے باب میں تھا، یہ تردد اس طرح تو دور نہیں ہو سکتا تھا کہ چند مانوس چڑیاں ان کی آواز پر ان کے پاس آ جائیں۔ اس قسم کا تجربہ تو تیتر، بٹیر، کبوتر اور شکرے پالنے والے ہر روز کرتے ہی رہتے ہیں۔ اگر یہی تجربہ حضرت ابراہیمؑ کو کرا دیا جاتا تو اس سے ان کی وہ الجھن کس طرح دور ہو سکتی تھی جو انھوں نے اپنے رب کے سامنے پیش کی تھی۔ یہ دور ہو سکتی تھی تو اسی شکل میں دور ہو سکتی تھی جب ایک شے کے اجزا فنا اور انتشار کے بعد از سر نو مختلف گوشوں سے جمع ہو کر حیات تازہ حاصل کریں۔

پرندوں کا واقعہ حضرت ابراہیمؑ کا مشاہدۂ خاص تھا

البتہ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ واقعہ ان معجزات میں سے نہیں ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے اپنی قوم پر حجت قائم کرنے کے لیے ظاہر ہوئے۔ بلکہ یہ ان مشاہدات میں سے ہے جو ذاتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لیے کرائے گئے کہ ان کو اطمینانِ قلب اور شرح صدر کی دولت حاصل ہو۔ اس قسم کے مشاہدات حضرات انبیاء علیہم السلام کو اس لیے کرائے جاتے ہیں کہ ان کی تربیت ہو اور وہ اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے لیے پوری طرح اہل ہو جائیں جو قدرت کی طرف سے ان پر ڈالا جاتا ہے۔ دوسرے طالبینِ حق بھی اس میں سے حصہ پاتے ہیں لیکن ان کا حصہ ان کی استعداد اور ان کے درجے اور مرتبے کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اس قسم کا مشاہدہ عالم ظاہر میں بھی ہو سکتا ہے اور عالم روح میں بھی۔ مگر جس کو ہوتا ہے اس کے لیے موجب اطمینان و یقین ہوتا ہے اور یہی ان کا مقصود ہوتا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی صفات۔ عزیز، حکیم۔ پر نگاہ جمائے رکھنے کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ انھی صفتوں کی یادداشت سے یہ یقین مضبوط ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو دوبارہ ضرور اٹھائے گا اس لیے کہ وہ اس پر قادر بھی ہے اور ایسا کرنا اس کی حکمت کا مقتضیٰ بھی ہے۔

۴۸۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۲۶۱-۲۷۴

ہم اوپر یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ یہاں اصل سلسلۂ بیان تو جہاد و انفاق کا تھا لیکن آیت لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ میں ہدایت و ضلالت سے متعلق ایک سنت اللہ کا ذکر آگیا تھا جس کی وضاحت کے لیے مذکورہ مثالوں کا ذکر ضروری ہوا اور اس طرح اس بحث میں وسعت پیدا ہوگئی۔ اب یہ ضمنی بحث ختم ہوگئی اور انفاق کا مضمون جو سلسلے کا اصل مضمون تھا پھر سامنے آگیا اور نہایت تفصیل کے ساتھ انفاق کی برکات، اس کی خصوصیات اور اس کی آفات بیان ہوئیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۶۱ تا ۲۷۴

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ﴿۲۶۳﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ

جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ
لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٦٥﴾
اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ
اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ
فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ
مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ
وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿٢٦٧﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ
وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾ ۖۙ يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ
الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾
وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ
وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ
وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ
عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٧١﴾ لَيْسَ
عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا

مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ؗ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ ع الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

وقف منزل

ترجمہ آیات ۲۶۱-۲۷۴

ان لوگوں کے مال کی تمثیل جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کے مانند ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اللہ برکت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اللہ بڑی گنجائش والا اور علم والا ہے۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے نہ دل آزاری کرتے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ اور نہ تو ان کے لیے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ دلداری کا ایک کلمہ کہہ دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو، اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔ اے ایمان والو، احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے اپنی خیرات کو اکارت مت کرو، اس شخص کے مانند جو اپنا مال دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر وہ ایمان نہیں رکھتا۔ ایسے شخص کی تمثیل یوں ہے کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کا

مینہ پڑے اور وہ اس کو بالکل سپاٹ پتھر چھوڑ جائے۔ ان کی کمائی میں سے کچھ بھی ان کے پلّے نہیں پڑے گا اور اللہ ناشکروں کو بامراد نہیں کرے گا۔ ۲۶۱-۲۶۴

اور ان لوگوں کے عمل کی تمثیل جو اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اس باغ کے مانند ہے جو بلندی پر واقع ہو۔ اس پر بارش ہو گئی تو وہ دو چند پھل لایا، بارش نہ ہوئی تو پھوار بھی کافی ہو گئی اور اللہ جو کچھ بھی تم کر رہے ہو، اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۶۵

کیا تم میں سے کوئی بھی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، نیچے اس کے نہریں بہہ رہی ہوں، اس میں اس کے واسطے ہر قسم کے پھل ہوں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی ناتواں ہوں اور باغ پر سموم کا بگولا پھر جائے اور وہ جل کر خاک ہو جائے۔ اللہ اس طرح اپنی باتیں تمھارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ ۲۶۶

اے ایمان والو، اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں اور اس میں سے وہ مال تو خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو، جس کو خدا کی راہ میں تو خرچ کرنے پر آمادہ ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمھیں لینا پڑ جائے تو بغیر آنکھیں میچے اس کو نہ لے سکو اور اس بات کو خوب یاد رکھو کہ اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ ۲۶۷

شیطان تمھیں تنگ دستی سے ڈراتا اور بے حیائی کی راہ سجھاتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ وہ جس کو

چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔ مگر یاد دہانی وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹

اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے یا جو کچھ بھی نذر مانو گے تو یاد رکھو کہ اللہ اس سے اچھی طرح واقف ہے اور ان لوگوں کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۲۷۰

اور اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر تم ان کو چھپاؤ اور چپکے سے غریبوں کو دے دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تمھارے گناہوں کو جھاڑ دے گا اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ ۲۷۱

ان کو ہدایت دینا تمھارے ذمے نہیں ہے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے اس کا نفع تمھیں کو حاصل ہونا ہے اور نہ خرچ کیجیو مگر اللہ کی رضا جوئی ہی کے لیے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے وہ تم کو پورا کر دیا جائے گا اور تمھارے حق میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی۔ ۲۷۲

یہ ان غریبوں کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، زمین میں کاروبار کے لیے نقل و حرکت نہیں کر سکتے، بے خبر ان کی خودداری کے سبب ان کو غنی خیال کرتا ہے، تم ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ جو لوگ اپنے مال رات اور دن، پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور نہ ان کے لیے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴

۸۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۶۱)

'فی سبیل اللہ' کا مفہوم

"فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کے تحت وہ سارے کام آتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیے جائیں۔ حالات کے اعتبار سے کوئی کام زیادہ اہم ہو سکتا ہے، کوئی کم، لیکن جو کام بھی رضائے الٰہی کے لیے اور شریعت کی ہدایات کے تحت کیا جائے وہ فی سبیل اللہ ہے۔

'انفاق فی سبیل اللہ' کی تمثیل

یہ اس بڑھوتری کی تمثیل ہے جو راہِ خدا میں خرچ کیے ہوئے مال کے اجر و ثواب میں ہوگی۔ فرمایا کہ جس طرح ایک دانے سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں اسی طرح ایک نیکی کا صلہ سات سو گنے تک بندے کو آخرت میں ملے گا۔ اس مضمون کی وضاحت احادیث میں بھی ہوئی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ نیکیوں کا بدلہ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ملے گا۔ یہ فرق ظاہر ہے کہ عمل کی نوعیت، عمل کے زمانے اور عمل کرنے والے کے ظاہری و باطنی حالات پر مبنی ہوگا۔ اگر ایک نیکی مشکل حالات اور تنگ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اس کا اجر زیادہ ہوگا اور اگر ایک نیکی آسان حالات اور کشادہ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اس کا اجر کم ہوگا۔ پھر نیکی کرنے والے کے احساسات کا بھی اس پر اثر پڑے گا۔ ایک نیکی پوری خوش دلی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری سرد مہری اور نیم دلی کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ دونوں کے اجر و ثواب میں بھی فرق ہوگا۔ آیت میں اجر کی وہ شرح بیان ہوئی ہے جو سب سے اونچی ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھاتا ہے۔ یہ اس ضابطے کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی چاہنا بھی عدل و حکمت کے خلاف نہیں ہوتا اس وجہ سے یہ بڑھوتری انہی کے لیے وہ چاہتا ہے جو اس کے ٹھہرائے ہوئے ضابطے کے مطابق اس کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

'واسع علیم' کا محل

"وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" میں ایک تو یہ بات واضح فرمائی کہ اجر کی اس وسعت پر بندہ اپنی تنگ دامانی پر قیاس کر کے حیران ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ غیر محدود سمائی رکھنے والا ہے، دوسری یہ بات فرمائی کہ خدا کی راہ میں جو چھوٹی یا بڑی، پوشیدہ یا علانیہ نیکی کی جاتی ہے سب اس کے علم میں رہتی ہے اس وجہ سے ہر شخص اپنے اجر کی طرف سے مطمئن رہے۔ جب دینے والے کا خزانہ بھی غیر محدود ہے اور اس کا علم بھی غائب و حاضر سب پر محیط ہے تو تشویش کی گنجائش کہاں باقی رہی!

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲۶۲)

"اذیٰ" کا لفظ ہر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو باعثِ رنج و اذیت ہو عام اس سے کہ یہ رنج و اذیت جسمانی ہو یا جذباتی و روحانی۔ یہاں اس سے مراد وہ طعن و تشنیع اور توہین و تحقیر ہے جو عموماً کم ظرفوں کی طرف سے ان لوگوں کے لیے ظاہر ہوتی ہے جن پر وہ کبھی کوئی احسان کر بیٹھتے ہیں۔

انفاق کے اجر کے اصل حق دار

فرمایا کہ یہ اجرِ عظیم جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوا ان خرچ کرنے والوں کے لیے ہے جو خرچ کرنے کے بعد نہ تو ان لوگوں پر کوئی احسان جتائیں جن پر انھوں نے خرچ کیا ہے اور نہ کسی پہلو سے ان کی کوئی دل آزاری کریں۔ واضح رہے کہ یہ احسان جتانا اور دل آزاری کرنا دونوں چیزیں ایک ہی فاسد کردار کے دو پہلو ہیں۔ لئیم اور کم ظرف لوگ اگر کسی پر کچھ خرچ کر بیٹھتے ہیں تو اس کے بدلے میں ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ شخص زندگی بھر ان کا ممنونِ احسان بلکہ زر خرید غلام بن کے رہے۔ اگر وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو رہی ہے تو پھر وہ اس کو اپنے طعنوں کا ہدف بنا لیتے ہیں اور جہاں ان کو موقع ملتا ہے اس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔ اجر ان لوگوں ہی کے لیے ہے جن کا انفاق اس بلا سے محفوظ رہے۔

"لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" دوسری جگہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ جنت کی تعبیر ہے اس لیے کہ جنت ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا۔ یہاں جنت کی تعریف ان لفظوں میں جو کی گئی ہے اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ انفاق کرنے والے اس جنت کے سزاوار اس لیے ٹھہریں گے کہ نہ تو خدا کی راہ میں خرچ کر کے انھوں نے کبھی اس بات کا غم کیا کہ کیوں خرچ کر دیا اور نہ کبھی شیطان کے ڈراووں سے متاثر ہو کر مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا ہوئے کہ کل کیا کھائیں گے سو ان کے اس حوصلے کے صلے میں خدا ان کو سات سو گنے تک اجر بھی دے گا اور وہ بہشت بھی جو ماضی اور مستقبل دونوں طرف سے انھیں مطمئن اور بے غم کر دے گی۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ (۲۶۳)

یہاں اگرچہ صرف "اذیٰ" (دل آزاری) کا ذکر ہوا، احسان جتانے کا ذکر نہیں ہوا لیکن ظاہر ہے کہ مراد دونوں ہی باتیں ہیں۔ ایک کے حذف کر دینے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ یہ درحقیقت ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں۔ جہاں احسان جتانا ہے وہاں ایذا ہے، جہاں ایذا ہے وہاں احسان جتانا بھی ہے۔

دلداری کا ایک کلمہ اس خیرات سے بہتر ہے جس کے ساتھ دل آزاری ہو

فرمایا کہ دلداری کا ایک کلمہ اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو۔ سائلوں اور محتاجوں سے اچھے انداز میں بات کرنے اور ان کے غلط رویہ سے درگزر کرنے کی ہدایت قرآن میں بار بار ہوئی ہے اس کے وجوہ پر ہم اسی سورہ کی آیت ۸۳ کے تحت تفصیل کے ساتھ نظائر قرآن کی روشنی میں بحث کر چکے ہیں۔ آدمی میں اگر غنا کے ساتھ حلم نہ ہو تو وہ انفاق کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اگر وہ انفاق کرتا

بھی ہے تو بسا اوقات ثواب کمانے کے بجائے الٹا اس سے گناہ کما لیتا ہے۔ جن کے پاس مال ہوتا ہے ان کے اندر عموماً ایک احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے اس وجہ سے وہ محتاجوں اور سائلوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ اکثر مانگنے والوں کو جھڑک دیتے ہیں۔ بعض اوقات سائلوں کا رویہ بھی کچھ ناگوار ہوتا ہے جو تنک مزاج مال داروں کے پارے کو اور بھی گرم کر دیتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ اصلی مستحقین کو اس لیے نظر انداز کر جاتے ہیں کہ کسی صحیح یا غلط بنیاد پر ان کو ان سے شکایت ہوتی ہے۔ یہ تمام خرابیاں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ اکثر مالداروں کے پاس مال تو ہوتا ہے لیکن ان کے مال کی نسبت سے ان کے اندر عفو و درگزر کی صفت نہیں ہوتی۔ قرآن نے اسی بنیاد پر جہاں انفاق کی تاکید کی ہے وہاں اس صفت کی بھی تاکید کی ہے۔ اس کے بغیر کوئی انفاق احسان کا درجہ حاصل نہیں کرتا۔ آل عمران کی ایک آیت ملاحظہ ہو۔ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۱۳۴- آل عمران (جو خرچ کرتے ہیں خوش حالی اور تنگ دستی میں اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ خوب کار ہیں اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے)۔

یہاں غنی و حلیم کی صفات کے حوالے میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ اللہ چونکہ غنی ہونے کے ساتھ ساتھ حلیم بھی ہے اس وجہ سے اپنے بندوں کی تمام کوتاہیوں اور نافرمانیوں کے باوجود ان کو اپنے جود و کرم سے نوازتا رہتا ہے، اگر وہ بندوں کی کوتاہیوں پر ان کو اپنے فضل سے محروم کر دیا کرے تو کون ہے جو کسی فضل کا مستحق قرار پا سکے۔ یہ اس غنی کا حلم ہی ہے جس کی بدولت نیکوکار اور گنہگار سب اس کے خزانے سے رزق پا رہے ہیں۔ جب اس کی صفات یہ ہیں تو وہ چاہتا ہے کہ انہیں صفات کا عکس اس کے بندوں کے اندر بھی نمایاں ہو۔ یعنی جن کو اس نے غنی بنایا ہے، ان کے اندر ان کے غنا کے بقدر بردباری بھی ہو۔

'غنی' و 'حلیم' کی صفات کا تقاضا

دوسرا پہلو یہ ہے کہ غریبوں کی آستینوں کے اندر سے جو ہاتھ مالداروں کے سامنے پھیلتا ہے وہ، جیسا کہ مشہور حدیث قدسی میں وارد ہے، درحقیقت خدا ہی کا ہاتھ ہوتا ہے اس وجہ سے اس ہاتھ کی تحقیر کرنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ وہ جس ہاتھ کو رد کر رہے ہیں یہ درپردہ اسی غنی کا ہاتھ ہے جس کے ہاتھ سے انھوں نے سب کچھ پایا ہے۔ اگر ان کی طرف سے اس طرز عمل کے باوجود بھی وہ ان سے درگزر فرما رہا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حلیم ہے۔ ورنہ حق تو یہ تھا کہ ایسے ناشکرے لوگ خدا کی ہر نعمت سے محروم کر دیے جاتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶۴)

'صفوان' کے معنی

'صَفْوَانٌ' کے معنی چکنے پتھر یا چکنی چٹان کے ہیں۔

'وابل' کے معنی

وابل کے معنی ہیں زور کی بارش، زور کا دونگڑا۔

'صلد' کے معنی

صلد کے معنی سخت اور چکنی چیز کے ہیں۔ 'ارض صلد' یا 'مکان صلد' اس زمین کو کہیں گے جہاں کوئی چیز اُگتی نہ ہو، 'راس صلد' ایسے سر کو کہیں گے جس پر بال نہ اگتے ہوں۔

تمثیل میں مدنظر صورت

پہاڑوں پر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی بڑی چٹان پر ادھر ادھر سے مٹی آ کر جم جاتی ہے جس سے ایک موٹی تہ بن جاتی ہے۔ کسان بعض اوقات اس کو زرخیز پا کر اس پر کھیتی شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی زمینوں کو کبھی کبھی یہ خطرناک صورت پیش آتی ہے کہ پہاڑ کے بالائی حصے میں زور کی بارش ہوئی اور اس کا ریلا جو آیا تو اس نے ساری مٹی والی سطح وادی کی طرف پھسلا دی اور نیچے صرف سخت چٹان رہ گئی۔ پہاڑی علاقوں سے اس قسم کے حوادث کی اطلاعات اخبارات میں وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں۔ اس کو (landslide) کہتے ہیں۔ یہاں تمثیل میں یہی صورت مدنظر ہے۔

فرمایا کہ جو لوگ انفاق کر کے احسان جتاتے یا دل آزاری کرتے ہیں ان کی خیرات بالکل اکارت جاتی ہے، آخرت میں ان کو اس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ ایمان پر ہونے کے باوجود ان کا یہ عمل اسی طرح ضائع ہو جائے گا جس طرح اس شخص کا عمل ضائع ہو جائے گا جو محض دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس سے احسان جتانے اور ایذا دینے کی غایت درجہ سنگینی واضح ہوتی ہے کہ آدمی کے انفاق کو برباد کر دینے کے معاملے میں یہ باتیں بالکل کفر کے برابر ہیں۔

ایسے شخص کی تمثیل اس کسان سے دی ہے جس نے اپنی فصل ایک ایسی زمین پر بوئی جس کے نیچے سخت اور چکنی چٹان تھی۔ بارش کا جو ایک زور کا دونگڑا پڑا تو اوپر کی ساری مٹی فصل سمیت وادی میں بہ گئی اور نیچے سے گنجے سر کے مانند چٹان نکل آئی۔ فرمایا کہ جس طرح اس محروم القسمت کسان کی ساری محنت اکارت چلی جاتی ہے اسی طرح اس خیرات کرنے والے کی خیرات برباد ہو کر رہ جاتی ہے جو خیرات کرنے کے بعد احسان جتاتا اور دل آزاری کرتا ہے۔ فرمایا کہ ایسے لوگ اپنی ساری خیر خیرات ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ اس کا کوئی حصہ بھی وہ بچا نہیں پاتے۔

ہدایت کی مختلف صورتیں

"وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الآية" میں جس ہدایت کا ذکر ہے وہ غایت و مقصود کی ہدایت ہے۔ ہم تفسیر کے شروع میں بیان کر آئے ہیں کہ ہدایت کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک ہدایت جبلت و فطرت کی ہدایت ہے جو سب حیوانات اور انسانوں کو عطا ہوئی ہے۔ ایک ہدایت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کی تدبیروں اور کوششوں میں بخشتا ہے جس سے وہ کسی کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایک ہدایت وہ ہے جو انبیا اور شرائع کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اور جس سے بندہ قبول حق کی توفیق پاتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک وہ ہدایت ہے جو آخرت میں حاصل ہوگی جس سے بندے اپنی کوششوں کے آخری ثمرات و نتائج کی طرف رہنمائی حاصل کریں گے۔ ہدایت کا لفظ قرآن میں ان تمام مقاصد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ آیت زیر بحث

میں یہ لفظ ہمارے نزدیک اسی آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو کافر اور ناشکرے لوگ ہیں وہ اپنے اعمال میں بامراد نہ ہوں گے بلکہ ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۲۶۵)

تثبیت کا مفہوم

"تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ" تثبیت کے معنی مضبوط کرنے، جمانے اور مستحکم کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ اپنے مال خدا کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ اس مقصد سے بھی خرچ کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے نفس کی تربیت کریں کہ وہ دین کے احکام کی تعمیل میں اچھی طرح پختہ ہو جائے۔ مِنْ یہاں گویا تَثْبِیْتًا کے مفعول پر داخل ہے۔

انفاق تربیت نفس کے لیے ریاضت ہے

جس طرح روزے سے مقصود نفس کی تربیت ہے کہ آدمی تقویٰ کے مطالبات پورے کرنے کے لیے اچھی طرح مضبوط ہو جائے اسی طرح انفاق بھی ایک ریاضت ہے جس سے انسان اپنے نفس پر قابو پاتا ہے اور خدا کے قرب کی راہ اس کے لیے آسان ہوتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ بات نکلی کہ تمام دوسری عبادات کی طرح انفاق کا حقیقی فائدہ بھی خدا کی طرف نہیں بلکہ بندے ہی کی طرف لوٹتا ہے، دوسری طرف یہ کہ سب سے اعلیٰ انفاق وہ ہے جو قحط کے زمانے میں ہو، جو غربت کے باوجود ہو، جو اپنی ذاتی ضروریات کو نظر انداز کر کے ہو، جو عزیز و محبوب مال میں سے ہو اور خاص طور پر ان حق داروں کے لیے ہو جن سے آدمی کا دل خوش نہ ہو اس لیے کہ یہی انفاق ہے جس سے نفس کو حق پر جمائے رکھنے کی حقیقی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو خواہشاتِ نفس کے خلاف چلانے میں جتنا مشاق ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کے لیے خدا کا قرب حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

ربوۃ کی تحقیق

"ربوۃ" کے معنی بلند و مرتفع زمین کے ہیں۔ استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتفع ہونے کے ساتھ ساتھ مسطح اور ہموار ہونا بھی اس کی خصوصیات میں سے ہے۔ قرآن میں اس کی صفت ایک دوسرے مقام میں ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ (۵۰ مومنون) آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلندی کے ساتھ ہمواری بھی اس کے لوازم میں سے ہے۔ بلند اور ہموار زمین کے لیے آب و ہوا کی خوشگواری ایک مسلّم شے ہے۔ اگر ایسی زمین پر باغ ہو تو اس کی بلندی ایک طرف تو اس کی خوش منظری کا باعث ہوتی ہے، دوسری طرف اس کو سیلاب وغیرہ سے محفوظ کرتی ہے۔ نیز ہموار زمین پر ہونے کے سبب سے اس کے لیے اس طرح پھسل کر فنا ہو جانے کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا جو ڈھلوان زمینوں کے باغوں اور فصلوں کے لیے ہوتا ہے۔ پھر آب و ہوا کی خوبی اس کی بارآوری کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر موسم سازگار رہا تو پوچھنا ہی کیا ہے اگر سازگار نہ ہوا جب بھی وہ پھل دے جاتا ہے۔

اس انفاق کی تمثیل جو رضائے الٰہی کے لیے ہو

یہ اوپر والے گروہ کے بالمقابل ان لوگوں کے انفاق کی تمثیل ہے جو اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنے نفس کی تربیت کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ فرمایا یہ لوگ بلاشبہ اپنے انفاق کا اجر پائیں گے۔ انھوں

نے بہہ جانے والی زمین پر باغ لگانے کے بجائے ایسی بلند، مسطح اور اچھی آب و ہوا والی زمین پر اپنا باغ لگایا ہے کہ بارش ہو تو اس کو برباد کرنے کے بجائے اس کی بار آوری کو دوگنا کر دیتی ہے اور اگر بارش نہ ہو تو ہلکی پھوار بھی آب و ہوا کی خوبی کی وجہ سے اس کے لیے کفایت کر جاتی ہے۔

'وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ' تسکین و تسلی کے لیے ہے۔ یعنی اللہ کے نیک بندے اس کی رضا جوئی اور اپنے نفس کی تربیت کے لیے جو ریاض کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں ہے، وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے ہر بندے کو اس کی محنت اور اس کے ایثار کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲۶۶)

باغ کے معاملے میں اہل عرب کا ذوق

'جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ' یہ عرب کے تصور کے مطابق ایک اچھے باغ کی تصویر ہے۔ ان کے ہاں اچھے باغ کا تصور یہ ہے کہ اس کے کنارے کھجوروں کے درخت ہوں، بیچ میں انگور کی بیلیں ہوں، مناسب مواقع سے مختلف فصلوں کی کاشت کے لیے قطعات ہوں، باغ بلندی پر ہو، اس کے نیچے نہر بہہ رہی ہو جس کی نالیاں باغ کے اندر دوڑا دی گئی ہوں۔

قرآن نے دوسری جگہ ایک باغ کی تصویر اس طرح کھینچی ہے جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۳۲-۳۳ کہف (ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ بنائے، اور ان کو گھیر دیا کھجوروں سے اور ان کے درمیان کھیتی بھی رکھی، دونوں باغ خوب پھل لائے، ذرا کمی نہ کی، اور ہم نے ان کے درمیان ایک نہر جاری کی) اس سے معلوم ہوا کہ باغ کے کناروں پہ کھجوروں کے درخت ہوتے تھے تاکہ ان سے پھل بھی حاصل ہو سکے، گرمی، لو، باد تند اور تمازت آفتاب سے باغ محفوظ بھی رہ سکے اور باغ کی رونق میں بھی اضافہ ہو سکے۔ پھر بیچ بیچ میں انگور اور دوسرے پھل دار درخت بھی لگائے جاتے اور مناسب ٹکڑوں میں مختلف فصلوں کی کاشت بھی ہوتی۔ زیر بحث آیت میں لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ سے اسی آخری چیز کی طرف اشارہ ہے۔ ہم ایک دوسرے مقام میں یہ بات وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ عربی میں ثمرات کا لفظ صرف میوہ جات کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ غلہ جات بھی اس میں شامل ہیں۔

لفظ اعصار کی تحقیق

'اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ' اعصار کے معنی گردباد اور بگولے کے ہیں۔ اس کے ساتھ جس آگ کا ذکر ہے وہ ہماری معروف آگ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد سموم اور لو ہے جو بسا اوقات گردباد کے اندر پائی جاتی ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو باغ اس کی زد میں آجاتا ہے وہ بالکل جھلس کے رہ جاتا ہے۔

اوپر ریاکاری، احسان داری اور ایذا رسانی کی آفتوں سے اپنے انفاق کو برباد کرنے والوں کی تمثیل

سنائی ہے۔ یہ تمثیل اس کی مزید وضاحت ہے۔ اس میں یہ دکھایا ہے کہ اس طرح انفاق کرنے والے عین اس وقت اپنی امیدوں کے باغ کی بربادی کا حسرت انگیز منظر دیکھیں گے جب وہ اس کے سبب سے زیادہ محتاج ہوں گے اس لیے کہ اس وقت ان کے لیے سعی و عمل کے دروازے بند ہو چکیں گے۔

اوپر والی تمثیل کی مزید وضاحت

یہ تمثیل ایک ایسے شخص کی ہے جس نے انگور اور کھجوروں کا باغ لگایا، اس باغ کے نیچے نہر جاری تھی جو اس کی شادابی کی ضامن تھی۔ باغ میں دوسرے مختلف قسم کے پھل بھی تھے اور اس سے ہر قسم کی اجناس بھی حاصل ہوتی تھیں۔ باغ کا مالک بوڑھا ہو گیا اور اس کے بچے سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ اسی دوران میں ایک روز سموم کا ایک بگولا اس باغ پر گزرا اور سارا باغ تباہ ہو کر رہ گیا۔ فرمایا کہ یہی حال آخرت میں ان لوگوں کا ہو گا جو اپنے انفاق کو برباد کرنے والی آفتوں سے نہیں بچاتے۔ ان کے خرمن کے لیے بجلی خود ان کی آستینوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہے اور وہ ٹھیک اس وقت ظاہر ہو گی جب ان کے لیے کھو کر پھر پانے کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ (۲۶۷)

طیبات کا مفہوم

'مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ' (اپنی کمائی کے پاکیزہ حصے میں سے) میں طیبات کا لفظ بیک وقت دو باتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنی کمائی میں سے وہی مال خرچ کرو جو پاکیزہ طریقے سے آیا ہو، غلط یا مشتبہ طریقے سے نہ آیا ہو۔ دوسری یہ کہ مال بجائے خود اچھا ہو، بے وقعت، گھٹیا اور نکما نہ ہو۔ غلط طریقے سے آئے ہوئے یا نکمے مال سے نہ تو خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے اور نہ نفس کی وہ تربیت ہو سکتی جس کا ذکر اوپر 'تثبیت' کے لفظ سے ہوا ہے۔

'وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ' کا علیحدہ ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ 'مِمَّا كَسَبْتُمْ' والے ٹکڑے سے مراد وہ مال ہے جو تجارت وغیرہ کے طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ زمین کی پیداوار کے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پیداوار پر زکوٰۃ کا نظام دوسرے اموال سے بالکل مختلف ہے۔

مال خبیث کا انفاق قبول نہیں ہوتا

'وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ' میں ناپاک اور گھٹیا مال سے بچنے کی غایت درجہ تاکید ہے جس طرح 'لَا تَقْرَبُوْا' کا لفظ ہے کہ فلاں چیز کے پاس بھی نہ پھٹکو، اسی طرح 'لَا تَيَمَّمُوْا' کا مفہوم یہ ہے کہ برے مال کے دینے کا تو ارادہ بھی نہ کرو۔ پھر برے مال کی وضاحت بھی فرما دی کہ اس سے مراد اس طرح کا مال ہے جو خدا کی راہ میں دینے کے لیے تو تیار ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو آنکھیں میچے اور دل پر جبر کیے بغیر نہ لے سکو۔ جس چیز کو آدمی اپنے لیے پسند نہ کر سکے وہ خدا کو پیش کرنا، درآں حالیکہ سب کچھ اسی کا بخشا ہوا ہے انتہائی دنائت کی بات ہے اور اس سے خدا کی خوشنودی یا نفس کی تربیت حاصل ہونا تو الگ رہا اس سے مزید دوری و مہجوری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔

غنی اور حمید کی وضاحت

خدا، غنی و حمید ہے یعنی اللہ کسی کے مال اور کسی کی خیرات کا محتاج نہیں، وہ اگر لوگوں سے یہ چاہتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کریں تو اس لیے نہیں کہ اس کے خزانے میں کمی ہے بلکہ اس سے لوگوں کی وفاداری کا امتحان مقصود ہے کہ دیکھے کہ لوگ اس کے بخشے ہوئے مال کو جب خود اس کو دینے کا وقت آتا ہے تو کس طرح دیتے ہیں۔ پھر غنی کے ساتھ حمید کی صفت لگائی ہے۔ حمید کے معنی ہیں وہ ذات جو سزاوار حمد و تعریف کاموں کا منبع ہے۔ یعنی سب سے بے نیاز ہونے کے ساتھ اس کی ذات ستودہ صفات ہے، اس کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے اور سب اس سے فیضیاب ہوتے ہیں، نیک بھی اور بد بھی۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (۲۶۸)

فحشاء سے مراد

فَحْشَآء کے معنی کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کے ہیں۔ قرآن میں اس سے زنا، لواطت اور عریانی وغیرہ جیسے کھلے جرائم کو تعبیر کیا گیا ہے۔ امر کا لفظ جس طرح حکم دینے کے معنی میں آتا ہے اسی طرح مشورہ دینے اور سجھانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تحقیق اس کی ہم دوسری جگہ بیان کر آئے ہیں۔

انفاق کی راہ کی مزاحمتیں

یہ ان مزاحمتوں کی طرف اشارہ ہے جو شیطان اور اس کی ذریات کی طرف سے انفاق کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ آدمی جب کسی نیک کام میں خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان اور اس کے ایجنٹ اس کو دو طرح سے اس کے ارادے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک تو مستقبل کے موہوم خطرات سے اس کو ڈراتے ہیں کہ فلاں اور فلاں مشکل کام اس کے آگے پڑے ہیں اس وجہ سے وہ اپنے ہاتھ روکے رکھے، ورنہ سخت دشواریوں میں پھنس جائے گا۔ دوسرے اس کو عیاشی، مے نوشی، سینما بینی اور اسراف و تبذیر کی دوسری لتوں میں پھنساتے ہیں تاکہ کسی اعلیٰ مقصد میں خرچ کرنے کے لیے کوئی گنجائش اس کے پاس باقی ہی نہ رہ جائے۔ شیطان کا فتنہ بڑا ہی سخت و شدید ہے۔ جو لوگ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اپنی بدمستیوں میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے بندوں میں سے کسی کا حق ادا کرنے کے قابل رہ ہی نہیں جاتے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں انفاق کا حکم دیا ہے وہاں شیطان کے اس ہتھکنڈے سے بچتے رہنے کی خاص طور پر تاکید فرمائی ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ	قرابت مند اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور اپنے
وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا	مال کو عیاشیوں میں نہ اڑاؤ، بے شک اس طرح اپنے
اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ	مال کو اڑانے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان
کَفُوْرًا ۝ (۲۶-۲۷۔ بنی اسرائیل)	اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔

بعینہٖ یہی مضمون اسی طرح کے سیاق و سباق کے ساتھ آل عمران کی آیات ۱۳۴، ۱۳۵ میں بیان ہوا ہے۔

وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ مغفرت، یہاں فحشاء کے مقابل میں ہے اور فضل کا لفظ فقر کے مقابل میں ہے۔ یعنی شیطان تو تمہیں اللہ کی راہ میں انفاق کے بجائے نفس کی راہ میں فضول خرچی

اور عیاشی کی راہ سجھاتا ہے تاکہ تمھیں سیدھے جہنم میں لے جائے لیکن اللہ اپنی راہ میں خرچ کی دعوت دے کر تمھیں مغفرت اور جنّت کی طرف بلاتا ہے۔ اسی طرح شیطان تمھیں فقر کے ہتھے سے ڈرا کر تمھارے دل بٹھاتا ہے لیکن اللہ تم سے اس انفاق کے عوض میں دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے بے پایاں فضل و انعام کا وعدہ فرماتا ہے۔ اللہ بڑا سمائی رکھنے والا اور تمھارے ایک ایک عمل سے واقف ہے۔ نہ اس کے پاس دینے کے لیے کمی ہے اور نہ وہ تمھارے راہِ خدا میں دیے ہوئے کسی پیسے دھیلے سے بے خبر ہے۔

یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲۶۹)

انفاق حکمت کے خزانے کی کلید ہے

لفظ 'حکمت' کی تشریح ہم اسی سورہ کی آیت ۱۵۱ کے تحت کر چکے ہیں۔ یہاں اس کا دہرانا باعثِ طوالت ہوگا۔ البتہ اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی اصل روح ایمان اور عمل کی وہ پختگی ہے جس کی بنیاد گہری بصیرت پر ہو۔ جس کو یہ چیز حاصل ہوتی ہے وہ اپنا خزانہ اس دنیائے فانی میں نہیں جمع کرتا بلکہ اپنے خدا کے پاس جمع کرتا ہے۔ وہ شیطان کے ڈراووں سے نہیں ڈرتا بلکہ اپنے پروردگار کے وعدوں پر اعتماد کرتا ہے اور اس دنیا کے خزف ریزے نہیں جمع کرتا بلکہ ان کے بدلے میں حکمت کے خزانے کا طالب بنتا ہے اور یہ حکمت کا خزانہ بہت بڑی چیز ہے۔ اتنی بڑی کہ دنیا کا کوئی خزانہ بھی اس کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ یہ خزانہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ یعنی اس کو دیتا ہے جو اس خزانے کے پانے کا استحقاق پیدا کرتے ہیں اس لیے کہ اللہ کا کوئی چاہنا بھی حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کی سنّت یہ ہے کہ جو اس دنیائے فانی کی لذتوں پر فریفتہ ہونے کے بجائے خدا کی مغفرت اور اس کے فضل کے حصول کے لیے اپنے مال لٹاتے ہیں وہ اس کے صلے میں اپنے دل کے خزانے حکمت کے لعل و گہر سے بھرتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ یہ بات ہر ایک کے سمجھنے کی نہیں ہے۔ اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ یعنی جن کی عقل حکمت کے نور سے منوّر ہے۔ اس دنیا کی نقد لذتوں کو چھوڑ کر ایک نادیدہ عالم کی کامرانیوں کے لیے اپنی کمائی کو لٹانا انھی لوگوں کا حوصلہ ہو سکتا ہے جن کو حکمت سے بہرۂ وافر ملا ہو۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَۃٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُہٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۲۷۰)

'نذر' کا مفہوم

'نذر' کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی منت مانے کہ اگر میری فلاں مراد پوری ہو گئی تو میں فلاں عبادت یا ریاضت یا اتنا صدقہ کروں گا۔ اسلام میں، جیسا کہ احادیث سے واضح ہے، منّت ماننے کو مستحسن نہیں قرار دیا گیا ہے لیکن کوئی شخص اگر اس طرح کی منت مان بیٹھے اور اس میں کسی شرعی قباحت کا کوئی پہلو نہ ہو تو اس کو پورا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک قسم کا عہد ہے جو منت ماننے والا اپنے رب سے کر رہا ہے اور عہد چھوٹا ہو یا بڑا اگر خلافِ شریعت نہیں ہے تو اس کو پورا کرنا ضروری ہے اس لیے کہ خدا کے ہاں ہر عہد سے متعلق، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، پرسش ہونی ہے۔ ہم سورۂ مائدہ میں بتائیں گے کہ تمام شریعت

اور تمام اخلاق کی بنیاد عہد ہی پر ہے اس وجہ سے اسلام نے اس پہلو میں کسی ڈھیل کو گوارا نہیں کیا ہے۔

'فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ' یہ ٹکڑا شرط کے جواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی جو شخص خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرتا ہے یا اس کے لیے کوئی منّت مانتا ہے تو وہ یہ اطمینان رکھے کہ خدا اس کی خیرات اور اس کی نذر ہر چیز کو اچھی طرح جانتا ہے۔ 'جانتا ہے' سے مقصود اس کا لازم ہے یعنی جب وہ جانتا ہے تو لازماً وہ اس کا اپنے وعدے کے مطابق صلہ بھی دے گا۔ زبان کا یہ اسلوب عربی زبان اور قرآن میں بہت عام ہے۔

'وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ' ظالم سے مراد یہاں خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں یعنی وہ لوگ جو یا تو دولتِ دنیا ہی کو معبود بنائے بیٹھے ہیں، خدا کی راہ میں سرے سے خرچ کرتے ہی نہیں یا خرچ کرتے ہیں تو ریا، احسان داری اور دل آزاری سے اس کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگ بدقسمت ہیں، ان کا سارا اعتماد انفاق و ایثار اور خدا کے فضل و رحمت کے بجائے اپنے مال اور اپنے جھوٹے معبودوں پر ہے، یہ ان پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں، حالانکہ خدا کے ہاں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ‌ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ؕ وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ (۲۷۱)

علانیہ اور پوشیدہ انفاق کے درجے

یہاں چونکہ زیرِ بحث عام صدقات و خیرات ہیں، صدقاتِ واجبہ نہیں ہیں جو علانیہ دیے جاتے ہیں، اس وجہ سے ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو پوشیدہ طور پر دینا بہتر ہے یا علانیہ۔ قرآن نے یہ اس سوال کا جواب دیا ہے کہ اگر ظاہر کر کے دو تو یہ بھی اچھا ہے، اس لیے کہ اس کے بھی بعض پہلو مفید ہیں، مثلاً یہ کہ اس سے دوسروں کو بھی انفاق کی ترغیب ہوتی ہے، خاص طور پر ان مواقع میں، جب کسی اجتماعی مہم کے لیے لوگوں کو ابھارنا اور شوق دلانا ہو، لیکن جب اس طرح کے حالات نہ ہوں تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ پوشیدہ طور پر غریبوں کو دے دو تاکہ ریا و نمائش کے فتنہ سے بھی محفوظ رہ سکو اور خوددار حاجت مندوں کی خودداری کی لاج بھی قائم رہ سکے۔ یہاں يُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ کا عطف فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ کے مفہوم پر ہے۔ یعنی اس پوشیدہ انفاق کا اجر بھی سوا ملے گا اور یہ تمہارے دامن سے گناہوں کو جھاڑنے میں بھی زیادہ کارگر ہوگا۔ پھر فرمایا کہ پوشیدہ اور علانیہ کا مسئلہ تمہارے لحاظ سے ہے۔ خدا سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں، تم جو کچھ بھی کرو گے جہاں بھی کرو گے، جس جگہ بھی کرو گے، خدا ہر چیز سے باخبر ہے۔

لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰٮهُمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلِاَنۡفُسِكُمۡ‌ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ‌ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ (۲۷۲)

خبر کے اسلوب میں انشائیہ جملہ

اس آیت میں کوئی خاص لفظ تحقیق طلب نہیں ہے صرف وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ الآیہ کے اسلوب کے باب میں کچھ تردد سا ہے۔ مجھے بار بار خیال ہوتا ہے کہ یہ خبر کے اسلوب میں انشائیہ جملہ ہے۔ عربی زبان میں یہ طریقہ معروف ہے۔ قرآن میں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں کہ امر یا نہی کے مضمون کو ان مواقع میں خبر یہ اسلوب

میں کر دیتے ہیں جب مخاطب کو کوئی بات شفقت اور التفاتِ خاص کے ساتھ سمجھانی ہو۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ کیا ہے۔ پچھلوں میں سے بھی بعض لوگوں نے اس کو اختیار کیا ہے۔ لیکن مجھے اس پر پورا پورا جزم نہیں ہے۔ اہلِ علم اس کو نگاہ میں رکھیں۔

پوری آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بیک وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بطریقِ التفات مخاطب فرمایا ہے اور عام مسلمانوں کو بھی۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت اللہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اس سنت اللہ کی یاد دہانی کی گئی ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اور جس کا ذکر اس سورہ میں بھی ایک سے زیادہ مقامات میں ہوا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی مختلف اسلوبوں اور شکلوں میں ہوا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ نبی کی ذمہ داری لوگوں کی ہدایت کے معاملے میں صرف یہ ہے کہ وہ ان کو اللہ کی تعلیمات و ہدایات سے اچھی طرح آگاہ کر دے۔ اگر یہ کام اس نے کر دیا تو اس کا فرض پورا ہو گیا۔ یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ لوگ ان تعلیمات و ہدایات کو قبول بھی کر لیں۔ ان کو قبول کرنے کی توفیق دینا اللہ کا کام ہے اور وہ یہ توفیق ان کو دیتا ہے جن کو چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس "چاہنے" کے لیے خود اس کا مقرر کیا ہوا ایک ضابطہ ہے جس کی وضاحت ہم آیات ۲۶، ۱۵۰۔۲۶۰ کے تحت کر چکے ہیں۔

مقصود اس سنت اللہ کی طرف اشارہ کرنے سے یہ ہے کہ در بابِ انفاق جو باتیں بتانی تھیں وہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفصیل کے ساتھ بتا دیں۔ آپ کا فرض ادا ہو گیا۔ اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ ان کو قبول کریں یا رد کریں۔ آپ اس چیز کے لیے پریشان نہ ہوں۔ اگر لوگ ان کی قدر نہ کریں گے تو اس کا خمیازہ خود ہی بھگتیں گے۔

خدا کو دینا اپنے لیے جمع کرنا ہے

مسلمانوں کو خطاب کر کے آخری تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ جو مال بھی تم خدا کی راہ میں خرچ کرو گے یہ نہ سمجھو کہ یہ کسی دوسرے کو دے رہے ہو بلکہ یہ تم اپنے ہی لیے جمع کر رہے ہو جو تمہیں سات سو گنے تک بڑھ کر ایک دن واپس ملنا ہے۔ بس یہ شرط ہے کہ تمہارا یہ خرچ کرنا اللہ کی خوشنودی کے سوا کسی اور مقصد سے نہ ہو۔ اللہ کی خوشنودی کے لیے جو کچھ خرچ کرو گے سب تمہارا پورا کر دیا جائے گا اس میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ (۲۷۳)

"لِلْفُقَرَآءِ" سے پہلے مبتدا محذوف ہے۔ یعنی یہ صدقہ و انفاق جس کی دعوت دی جا رہی ہے ان فقرا کے لیے ہے جن کی صفات یہ ہیں۔ مبتدا کے حذف کر دینے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ قرینہ خود اس پر دلیل ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے صدقے کے اخفا کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہو رہا ہے۔ گویا آیت نے انگلی اٹھا

کر محتاجوں کی طرف تو اشارہ کر دیا لیکن یہ بات کہ کس کام کے لیے اشارہ کیا گیا ہے، مخاطب کے فہم پر چھوڑ دی ہے۔ اس طرح صدقہ کے اخفا کے ساتھ ساتھ محتاجوں کی اس خودداری کی بھی آن محفوظ رہ گئی جس کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

"اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ" یعنی کسی دینی مقصد نے ان کو کسبِ معاش کی جدوجہد سے روک رکھا ہے۔ یہ لوگ تجارت وغیرہ کے لیے ادھر ادھر سفر نہیں کر سکتے۔ ضَرۡبٌ فِی الۡاَرۡضِ کے معنی سفر کرنے کے ہیں، مثلاً فرمایا ہے وَاٰخَرُوۡنَ یَضۡرِبُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ یَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ۔ مزمل (اور کچھ دوسرے ایسے بھی ہوں گے جو فضلِ الٰہی کی تلاش میں زمین میں سفر کریں گے)

یَحۡسَبُہُمُ الۡجَاہِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ، جاہل کے معنی یہاں بے خبر کے ہیں اور تَعَفُّفٌ کے معنی خودداری کے ہیں۔ یعنی یہ لوگ خودداری کے سبب سے کسی کے آگے نہ تو دستِ سوال دراز کرتے نہ اپنے فقر وفاقہ کا اظہار کرتے، اس وجہ سے جو شخص ان کے حالات سے بے خبر ہے ان کو مستغنی خیال کرتا ہے۔

تَعۡرِفُہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا، سیما کے معنی علامت اور ہیئت کے ہیں جیسا کہ فرمایا ہے سِیۡمَاہُمۡ فِیۡ وُجُوۡہِہِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ (ان کی پہچان، ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے)

لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ الآیۃ کا مفہوم

"اِلحاف" کے معنی لپٹ کر سوال کرنے کے ہیں۔ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا (وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے) میں اصل مقصود سوال کرنے کی نفی ہے، اِلۡحَافًا کی قید اس کے ساتھ صرف سوال کرنے والوں کی عام حالت کی تصویر اور اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے لگائی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے کہ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ خَشۡیَۃَ اِمۡلَاقٍ (اپنی اولاد کو فقر کے اندیشے سے قتل نہ کرو) اس میں ممانعت درحقیقت قتل کی ہے، خَشۡیَۃَ اِمۡلَاقٍ کی قید محض اس کے گھنونے پن کو واضح تر کرنے کے لیے ہے۔ یا فرمایا ہے کہ لَا تَاۡکُلُوا الرِّبٰۤوا اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَۃً (اور سود نہ کھاؤ دوگنا چوگنا کر کے) اس میں ممانعت دراصل سود کھانے کی ہے۔ اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَۃً کی قید محض اس کی کراہت کو نمایاں کرنے کے لیے ہے، یا فرمایا ہے لَا تُکۡرِہُوۡا فَتَیٰتِکُمۡ عَلَی الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا (اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ قیدِ نکاح میں آنا چاہتی ہیں) اس میں بھی مقصود مطلق اکراہ کی ممانعت ہے، اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا کی قید محض اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے ہے۔

اسی طرح لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا میں مقصود ان کے سوال کرنے کی نفی ہے، اِلۡحَافًا کی قید محض سوال کرنے والوں کی عام حالت کے اظہار کے لیے ہے کہ بھلا جو لوگ اتنے خوددار ہیں کہ جو ان کے حال سے بے خبر ہو وہ ان کو غنی سمجھتا ہے، وہ گداگروں اور بھک منگوں کی طرح کی حرکت کس طرح کر سکتے ہیں؟ چنانچہ ان کی اسی خودداری اور پردہ داری کی وجہ سے قرآن نے اہلِ انفاق کو ان کا سراغ دینے کے لیے ان

کی پہچان یہ بتائی ہے کہ ان کو صرف چہرے بشرے سے پہچان کر ڈھونڈھنے کی کوشش کرو اور ان کے پاس خود پہنچو، یہ توقع نہ رکھو کہ عام گداگروں کی طرح یہ لوگ تمہارے پیچھے پیچھے بھاگیں گے۔

قرآن کے زمانہ نزول میں اس آیت کے بہترین مصداق اہل صفہ تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ احادیث میں ان کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں وہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے ان اشارات کے مطابق ہیں۔ قرآن نے ان آیات میں وہ نمونہ بھی دکھا دیا ہے جو با ایمان فقراء کا ہونا چاہیے اور اس طریقے کی طرف بھی رہنمائی کر دی ہے جو ان فقراء کے معاملے میں با ایمان اغنیا کو اختیار کرنا چاہیے۔ آج کے فقرا اور آج کے اغنیا اس آئینہ میں اپنی شکلیں دیکھیں۔

آخر میں فرمایا کہ جو تم خرچ کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہے: یعنی ایسے خوددار سائلوں کو تلاش کر کے چپ چپاتے ان کی حاجت روائی کرنا خلق سے چھپا رہے گا لیکن خالق سے چھپا نہیں رہے گا، وہ تمہارے ہر انفاق سے باخبر ہے اور وہ اس کا بھرپور صلہ دے گا۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲۷۴)

اس آیت میں رات اور دن، پوشیدہ اور علانیہ میں جو مناسبت اور تقابل ہے وہ ملحوظ رہے سارے اوقات بھی سب احاطہ میں آ گئے ہیں، اور حالتیں بھی دونوں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ نیز اہل ایمان کے اندر انفاق کے لیے جو جوش ہونا چاہیے اسلوب کلام سے وہ خود بخود ابلا پڑ رہا ہے۔ علاوہ بریں انفاق کا خدا کے ہاں جو صلہ ہے وہ بھی پورا پورا بیان ہو گیا ہے۔ یہ آیت انفاق کے سلسلے میں خاتمۂ باب کی حیثیت رکھتی ہے۔

۸۶۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۷۵-۲۸۳

انفاق کے مضمون کے بعد اب آگے سود کی حرمت کا بیان ہوا۔ سود کا تعلق چونکہ قرض سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرض کے لین دین سے متعلق جو ضروری ہدایات ہیں اسی سلسلے میں وہ بھی دی گئیں۔ رہن بھی اسی سے تعلق رکھنے والی چیز ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ اس کا حکم بھی بیان ہوا۔

سود انفاق کا ضد ہے

سود کے متعلق یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ یہ انفاق کا بالکل ضد ہے۔ انفاق کی محرک بلند ہمتی، ہمدردی، فیاضی، ایثار، رحم دلی ہے اور سود کی محرک بزدلی، خود غرضی، سنگدلی اور دوسروں کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہے۔ انفاق ضرورت مندوں کو سہارا دینا چاہتا ہے اور سود گرے ہوؤں کا خون چوسنا چاہتا ہے۔ دونوں میں نسبت ضدین کی ہے اور فطرت کا اصول یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت اس وقت تک اچھی طرح واضح نہیں ہوتی جب تک اس کے ساتھ اس کے ضد کا بیان نہ ہو۔ اسی اصول کی بنا پر قرآن نے

اکثر چیزوں کے بیان میں یہ طریقہ ملحوظ رکھا ہے کہ ضدین کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے۔ مثلاً اہلِ ایمان کا بیان ہے تو اس کے ساتھ اہلِ کفر کا بھی بیان ہوا ہے۔ جنت کا ذکر آیا ہے تو اکثر اس کے ساتھ دوزخ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ یہاں تک کہ یہ چیز قرآن کے نظم کی ایک خصوصیت بن گئی ہے۔ اسی اصول پر قرآن نے انفاق کے ساتھ اکثر یا تو بخل کا ذکر کیا ہے یا سود خواری کا۔ یہاں اس کا ذکر انفاق کے بعد آیا ہے۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۳۰ میں انفاق کے بیان سے پہلے ہے۔ لیکن مقصود دونوں جگہ ایک ہی ہے کہ ایک کی تاریکی دوسرے کی روشنی کو اور ایک کا جمال دوسرے کی بدصورتی کو بے نقاب کر سکے۔ اس نظمِ کلام سے حکمت کے بعض ایسے گوشے آشکارا ہو جاتے ہیں جو کسی اور طریقے سے آشکارا نہیں ہو سکتے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۷۵-۲۸۳

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ

وقف لازم

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۣ

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ

بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ

اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ

وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا

اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ

فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا

فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ

وَلَا تَسْـَٔـــمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ

عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ

تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ

جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ

وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَ

يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ

وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ

بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع ۳۹

ترجمہ آیات ۲۷۵-۲۸۳

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس شخص کے مانند جس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے اور حال یہ ہے کہ اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا اور سود کو حرام۔ تو جس کو اللہ کی تنبیہ پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لیے ہے۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو اب اس کے مرتکب ہوں تو وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا، اور اللہ ناشکروں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کیے، نماز کا اہتمام کیا، زکوٰۃ ادا کی، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، نہ ان کے لیے کوئی اندیشہ ہوگا نہ ان کو کوئی غم لاحق ہوگا۔ ۲۷۵-۲۷۷

اے ایمان والو، اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود تمھارا باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کرلو تو اصل رقم کا تمھیں حق ہے۔ نہ تم کسی کا حق مارو، نہ تمھارا حق مارا جائے۔ اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو فراخی تک اس کو مہلت دو اور بخش دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو جو اس نے کمائی کی ہے پوری پوری مل جائے گی اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ ۲۷۸-۲۸۱

اے ایمان والو، جب تم کسی معین مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو اور اس کو لکھے تمہارے مابین کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ۔ اور جسے لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ جس طرح اللہ نے اس کو سکھایا اس طرح وہ دوسروں کے لیے لکھنے کے کام آئے اور یہ دستاویز لکھوائے وہ جس پر حق عاید ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ سے، جو اس کا رب ہے، ڈرے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اگر وہ، جس پر حق عاید ہوتا ہے، نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ ٹھہرا لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہی، یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں۔ دو عورتیں اس لیے کہ ایک بھول جائے گی تو دوسری یاد دلا دے گی۔ اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں۔ اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی مدت تک کے لیے اس کو لکھنے میں تساہل نہ برتو۔ یہ ہدایات اللہ کے نزدیک زیادہ قرین عدل، گواہی کو زیادہ ٹھیک رکھنے والی اور اس امر کے زیادہ قرین قیاس ہیں کہ تم شبہات میں نہ پڑو۔ ہاں اگر معاملہ دست بدست لین دین اور دست گرداں نوعیت کا ہو تب اس کے نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور تم کوئی معاملہ خرید و فروخت کا کرو تو اس صورت میں بھی گواہ بنا لیا کرو۔ اور کاتب یا گواہ کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچایا جائے اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہاری بڑی پائدار نافرمانی ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ تمھیں تعلیم دے رہا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ۲۸۲

اور اگر تم سفر میں ہو اور کاتب نہ مل سکے تو رہن قبضہ میں کرا دو، پس اگر ایک دوسرے پر اعتماد کی صورت نکل آئے تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ اس کی امانت ادا کرے

اور اللہ سے جو اس کا رب ہے ڈرے، اور شہادت کو چھپاؤ مت۔ جو اس کو چھپائے تو وہ یاد رکھے کہ اس کا دل گنہگار ہے، اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کو جاننے والا ہے۔ ۲۸۳

۸۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۷۵)

لفظ ربٰو کا مفہوم — رَبَا، یَرْبُو، رِبَاءً کے معنی بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں۔ اسی سے رِبٰو ہے جس سے مراد وہ معین اضافہ ہوتا ہے جو ایک قرض دینے والا مجرد مہلت کے عوض اپنے مقروض سے اپنی اصل رقم پر وصول کرتا ہے۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں یہ اصطلاح مذکورہ مفہوم کے لیے مشہور رہی ہے۔ اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں، لیکن اس کی اصل حقیقت یہی ہے کہ قرض دینے والا قرضدار سے ایک معین شرح پر صرف اس حق کی بنا پر اپنے دیے ہوئے روپے کا منافع وصول کرے کہ اس نے ایک خاص مدت کے لیے اس کو روپے کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ اس امر کو اس کی حقیقت کے تعین میں کوئی دخل نہیں ہے کہ قرض کسی غریب و نادار کو دیا گیا ہے یا کسی امیر و تاجر کو اور نہ اس بات سے اس میں کوئی فرق واقع ہوتا کہ قرض کسی میت کی تجہیز و تکفین کے لیے دیا گیا ہے یا کسی رفاہی اسکیم کے لیے دیا گیا ہے، یا تجارت، زراعت اور صناعت کے کسی انفرادی یا اجتماعی منصوبے کے لیے دیا گیا ہے۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں ربٰو کی اصطلاح کا جو مفہوم مسلم رہا ہے اس میں ان ظاہری اختلافات سے سرمو فرق واقع نہیں ہوتا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مقصد قرض یا قرضدار کی نوعیت و حیثیت کی تبدیلی ربٰو کی عرفی حیثیت کو بدل دیتی ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ خود قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے۔

تخبط کی تحقیق — 'تخبط' کا لفظ 'خبط اللیل' سے ہے جس کے معنی رات کی تاریکی میں بھٹکنے کے ہیں۔ خابط اللیل اس شخص کو کہیں گے جسے داہنے بائیں کا کچھ ہوش نہ ہو، بس یوں ہی ہرزہ گردی کر رہا ہو۔ اسی سے یخبط خبط عشواء کا محاورہ ان لوگوں کے لیے پیدا ہوا جو بصیرت سے بالکل محروم ہوں اور اندھے بھینسے کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہوں۔ اسی سے تَخَبَّطَهُ الشَّیْطٰنُ نکلا جس کے معنی ہیں مَسَّهُ الشَّیْطٰنُ بِخَبَلٍ اَوْ جُنُوْنٍ اس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل اور دیوانہ بنا دیا۔

مَسّ کے معنی

مَسّ کے اصل معنی چھونے کے ہیں۔ اس کا غالب استعمال کسی برائی، آفت اور دکھ کے پہنچنے اور لاحق ہونے کے لیے ہوتا ہے۔ ہم نے موقع کے لحاظ سے اس کا ترجمہ چھوت کیا ہے۔ جو لفظی بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ یوں تو دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا ہی کے اذن سے ہوتا ہے لیکن شیطان کو جن کاموں کے لیے مہلت ملی ہوئی ہے ان کی نسبت بعض اوقات اس کی طرف کر دی جاتی ہے۔ جیسے حضرت ایوبؑ کی دعا میں ہے اِنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۴۱ - ص (شیطان نے مجھے دکھ اور تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے) نیک بندوں پر تو ارواح خبیثہ کا اثر اس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ ان کو کوئی اذیت یا آزمائش پیش آجائے لیکن جن کی روحیں خود خبیث ہوتی ہیں، جس طرح ان کا قلب شیطان کی مٹھی میں ہوتا ہے اسی طرح کبھی کبھی ان کے عقل و دماغ سب پر شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے اور وہ ظاہر میں بھی بالکل پاگل ہو کر کپڑے پھاڑتے، گریبان چاک کرتے، منہ پر جھاگ لاتے اور پریشان حال، پراگندہ بال جدھر سینگ سمائے ادھر آوارہ گردی اور خاکبازی کرتے پھرتے ہیں۔

صاحب انفاق اور سود خوار کے ساتھ اللہ کے معاملے

اوپر اہل انفاق کے متعلق آپ پڑھ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تربیت فرماتا ہے، ان کو علم اور عمل دونوں میں رسوخ و عزیمت عطا فرماتا ہے، ان کے انفاق میں برکت بخشتا ہے، ان کا کارساز بن کر ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے، ان کو حکمت کا لازوال خزانہ بخشتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آخرت میں ان کو لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ کے سرورِ ازلی و ابدی سے نوازے گا۔

اب یہ اس کے بالکل مخالف کردار رکھنے والوں یعنی سود خواروں کا بیان ہے۔ ان کی نسبت فرمایا کہ یہ جب روزِ قیامت کو اٹھیں گے تو بالکل اس طرح اٹھیں گے جس طرح وہ شخص اٹھا کرتا ہے جس پر کسی جنّات یا بھوت کا سایہ ہو جس سے وہ بالکل مخبوط الحواس ہو رہا ہو۔ اس تشبیہ کی زیادہ وضاحت نہیں فرمائی ہے اس لیے کہ اس کے اجمال ہی میں ساری وضاحت موجود ہے۔ جس طرح قرآن میں ایک جگہ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ کی تشبیہ ہے جس کے الفاظ کو سن کر ہی دل پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، اسی طرح یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ کے الفاظ سے خود ہی وحشت زدگی اور پریشان حالی کی ایک ایسی تصویر سامنے آجاتی ہے جو کسی وضاحت کی محتاج نہیں رہ جاتی۔

آگے فرمایا کہ ان کی یہ حالت اس وجہ سے ہوگی کہ سود کی حرمت پر وہ اعتراض اٹھاتے تھے کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے تو پھر بیع کو اللہ نے حلال اور سود کو حرام کیوں ٹھہرایا؟ چونکہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو بالکل مخبوط الحواس ہو، جس کی عقل ماری گئی ہو اور شیطان نے جس کو اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو اس وجہ سے عمل اور جزا کی مشابہت کے قانون کے تحت، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (جو دنیا میں عقل اور دل کا اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا) ایسا شخص جب قیامت میں اٹھے گا تو پاگلوں اور دیوانوں کی طرح اٹھے گا۔

وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کا موقع و محل

یہاں ان کے قول کا حوالہ دے کر اس کو نظر انداز کر دیا ہے، اس کی تردید نہیں کی ہے۔ اس لیے کہ اس قول کی لغویت اتنی واضح ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو بالکل پاگل ہو چکا ہو اور پاگلوں کی کسی بات کی تردید کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ ہمارے اہلِ تاویل نے عام طور پر وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کے ٹکڑے کو ان کی اس بات کی تردید کے معنی میں لیا ہے اور اسی پہلو سے اس کی تاویل کی ہے۔ اگرچہ اس بات کا بھی ایک محل ہے کیونکہ اللہ کا کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا بجائے خود اس امر کی بہت بڑی دلیل ہے کہ عقل و فطرت اور معاش و معاد کے نقطۂ نظر سے اس چیز کی حلت یا حرمت بالکل معقول ہے لیکن یہ دلیل صرف مومن کے لیے قابلِ اعتماد ہے، منکر کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس وجہ سے مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا الگ نہیں ہے بلکہ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا کے تحت ہی ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو ربٰوا ہی کی طرح ہے، جب ایک تاجر اپنے سرمایہ پر نفع لیتا ہے تو ایک سرمایہ دار اگر اپنے سرمایہ کا نفع حاصل کرتا ہے تو آخر وہ مجرم کیوں ٹھہرے، پھر اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیوں ٹھہرایا؟ ہر چند یہ جملہ بشکل سوال نہیں ہے لیکن اس کے اندر وہی سوال یا اعتراض پوشیدہ ہے جو پہلے ٹکڑے کے اندر ہے۔

تاجر اور سود خوار کے سرمایہ میں فرق

اس اعتراض سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ سود کو بیع پر قیاس کرنے والے پاگلوں کی نسل دنیا میں نئی نہیں ہے بلکہ بڑی پرانی ہے۔ قرآن نے اس قیاس کو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، لائقِ توجہ نہیں قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بداہتًہ باطل اور قیاس کرنے والے کی دماغی خرابی کی دلیل ہے۔ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسے مال کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی لوگوں کو طلب ہوتی ہے، وہ محنت، زحمت اور خطرات مول لے کر اس مال کو ان لوگوں کے لیے قابلِ حصول بناتا ہے جو اپنی ذاتی کوشش سے اول تو آسانی سے اس کو حاصل نہیں کر سکتے تھے اور اگر حاصل کر سکتے تھے تو اس سے کہیں زیادہ قیمت پر جس قیمت پر تاجر نے ان کے لیے مہیا کر دیا۔ پھر تاجر اپنے سرمایہ اور مال کو کھلے بازار میں مقابلہ کے لیے پیش کرتا ہے اور اس کے لیے منافع کی شرح بازار کا اتار چڑھاؤ مقرر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس اتار چڑھاؤ کے ہاتھوں بالکل دیوالیہ ہو کر رہ جائے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ نفع حاصل کرے۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں کہ وہ ایک بار ایک روپے کی چیز ایک روپے دو آنے یا چار آنے میں بیچ کر پھر اس روپے سے ایک دھیلے کا بھی کوئی نفع اس وقت تک نہیں کما سکتا جب تک اس کا وہ روپیہ تمام خطرات اور سارے اتار چڑھاؤ سے گزر کر پھر میدان میں نہ اترے اور معاشرے کی خدمت کر کے اپنے لیے استحقاق نہ پیدا کرے۔

بھلا بتائیے کیا نسبت ہے ایک تاجر کے اس جانباز، غیور اور خدمت گزار سرمایہ سے ایک سود خوار کے اس سنگ دل، بزدل، بے غیرت اور دشمنِ انسانیت سرمایہ کو جو جوکھم تو ایک بھی برداشت

کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن منافع بٹانے کے لیے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ سود خور کا سرمایہ دو بھیسوں میں ظاہر ہوتا ہے اور دونوں ہی میں وہ یکساں بزدل اور خونخوار ہے۔ ایک تو یہ سودی کاروبار کرنے والے بنیوں، پٹھانوں اور یہودیوں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، اس شکل میں تو اس کی خونخواری سے کسی کے لیے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ ایک بنیا یا پٹھان جب ایک مرتبہ اپنے جال میں کسی کو پھنسا پاتا ہے تو چاہے اس مظلوم کے جسم پر گوشت کی ایک بوٹی بھی باقی نہ رہ گئی ہو لیکن وہ اپنی ہر میعاد پر آ کر اپنا ایک پونڈ گوشت کاٹ لے گا اور مدت العمر کی اس قطع و برید کے بعد بھی بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ نہ صرف بنیے کا اصل سرمایہ قرضدار پر لدا رہتا ہے بلکہ وہ اصل سے کئی گنا ہو کر اکاس بیل کی طرح مظلوم قرض دار کے گھر در، اس کے اثاث البیت اور اس کے زن و فرزند ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور خاندان کے خاندان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے رکھ دیتا ہے۔ بتائیے کس تاجر کے سرمائے میں یہ سکت ہے کہ وہ کسی پر یہ ظلم ڈھا سکے؟ وہ تو زیادہ سے زیادہ اگر کر سکتا ہے تو یہ کہ بازار کے سارے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کر کے اگر موقع پائے تو اپنی ایک روپیہ کی چیز ڈیڑھ یا دو روپے میں بیچ لے اور وہ بھی ایک مرتبہ۔

رفاہی کاموں اور اجتماعی منصوبوں کا سود

سود خور کے سرمایہ کا دوسرا بھیس وہ ہے جس میں وہ رفاہی کاموں، اجتماعی منصوبوں اور ملکی اسکیموں کی سرپرستی کے نام سے اٹھتا ہے۔ اس زمانے میں بہت سے سادہ لوح اس بھیس میں اس کو بڑا معصوم سمجھتے ہیں لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بزدلی اور خود غرضی کی فطرت بد اس کے اس جامے میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح پہلے بھیس میں موجود ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ فرض کیجیے ملک کی حکومت ملک کے کسی حصے کو سیلاب کی تباہ کاریوں سے یا کسی اور خطرے سے بچانے کے لیے کوئی بڑا منصوبہ عمل میں لانا چاہتی ہے اور اس کے لیے پانچ یا سات فی صد کی شرح پر لوگوں سے قرض لیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حکومت کا منصوبہ کروڑوں روپے خرچ کرنے کے بعد کسی ارضی و سماوی آفت کی زد میں آ کر تباہ ہو جائے۔ اب بتائیے کہ ملک نے تو بحیثیت مجموعی ایک شدید قسم کا نقصان اٹھایا لیکن جن سود خوروں نے اس کے لیے قرض دیے تھے نہ صرف ان کا سرمایہ محفوظ ہے بلکہ ایک معین شرح کے ساتھ اس کا سود بھی دمبدم اس میں اضافے پر اضافہ کیے چلا جا رہا ہے۔ آخر یہ قومی خدمت کی کون سی شکل ہوئی؟ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پہلی صورت میں اور اس دوسری صورت میں حقیقت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ پہلی صورت میں سود خور کو صرف اس امر سے بحث ہے کہ اس کا سرمایہ محفوظ رہے اور منافع کا ایک پونڈ گوشت بغیر کسی غل و غش کے فصل فصل پر اس کو ملتا رہے، چاہے قرض دار کی سات پشتیں فاقہ کرتی مر جائیں۔ اور اس صورت میں بھی اس کے سامنے یہی چیز ہے کہ اس کا اصل سرمایہ بے داغ محفوظ رہے، معین سود اس کے حساب میں جمع ہوتا رہے، رہا قوم کا مردہ تو وہ چاہے دوزخ میں جائے

یا بہشت میں۔

برعکس اس کے ایک تاجر کا سرمایہ قوم اور ملک کی خدمت کے لیے سب سے پہلے خود اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ اگر حالات کے ردوبدل، بازار کے اتار چڑھاؤ، یا کسی اور سبب سے اس کو نقصان پہنچ جائے تو اس نقصان کو وہ اپنے ہی اوپر برداشت کرتا ہے۔ اس کے لیے ایک لمحہ کے واسطے بھی اس بات کا امکان نہیں ہوتا کہ وہ سودخور کے سرمائے کی طرح کسی کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھے اور دوسروں سے اپنا نفع وصول کرتا رہے۔ اگر اس کو سازگار سے سازگار حالات بھی میسر آجائیں تب بھی بہرحال اس کے منافع کی شرح پر بازار کا فیصلہ ناطق ہوتا ہے اور اس طرح جو کچھ وہ حاصل کر پاتا ہے درحقیقت وہ اس کا جائز حق المحنت ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاجر کے منافع کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تعبیر فرمایا ہے اور سُود خور کے سرمایہ کو، جیسا کہ ہم سورۂ روم کی تفسیر میں واضح کریں گے، اس سانڈ سے تشبیہ دی ہے جو دوسروں کی چراگاہ میں چر کر فربہ ہو رہا ہو۔

سودخواروں کے لیے تنبیہ

فَمَنۡ جَآءَهٗ مَوۡعِظَةٌ الایۃ۔ موعظت کے لفظ میں زجر و تنبیہ کا پہلو غالب ہے اس وجہ سے اس کی اصل روح کو پیش نظر رکھ کر ہم نے اس کا ترجمہ تنبیہ کیا ہے۔ اس کی تانیث چونکہ غیر حقیقی ہے اس وجہ سے لفظ کے مفہوم کے لحاظ سے اس کے لیے فعل مذکر آیا ہے۔ مِنۡ رَبِّهٖ کے الفاظ نے اس تنبیہ کے اندر ایک خاص زور پیدا کر دیا ہے۔ یعنی یہ تنبیہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے بلکہ یہ سب کے مالک و آقا کی طرف سے تنبیہ ہے اس وجہ سے اس کو سہل نہیں خیال کرنا چاہیئے۔ فَلَهٗ مَا سَلَفَ یعنی اس تنبیہ کے بعد جو سودی لین دین سے رک گیا، اس سے اس کے پچھلے لیے ہوئے سود کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اس قانون کا نفاذ اگر ماضی پر بھی اثر انداز ہوتا تو اس سے ناقابلِ حل مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ وَاَمۡرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ یعنی ایسے شخص سے اسلامی حکومت تو اس کے سابق سودوں پر کوئی گرفت نہیں کرے گی لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا سے بھی اس کو معافی مل گئی، بلکہ اس کا معاملہ خدا کے حوالے ہے۔ خدا کے حوالے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کی پکڑ سے بچنے کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہے کہ آدمی سود نہ لے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے دل سے بھی سود کا ہر شائبہ نکل جائے۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس طرح کے لوگ آخرت سے بے خوف ہو کر نہ بیٹھ رہیں بلکہ جس حد تک بھی ہو سکے اپنے پچھلے مظالم کی تلافی کی کوشش کریں، اس لیے کہ یہ مظالم حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے ہیں اور حقوق العباد کا معاملہ خدا کے ہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ۔ یعنی اس واضح تنبیہ کے بعد بھی جو لوگ سودی کاروبار کریں گے وہ دوزخی ہیں اور وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے دائمی دوزخ کی سزا کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ان کا یہ رویہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ خدا کے اس حکم

کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی اگر جذبات کے غلبے کے سبب سے ہو جاتی ہے تو توبہ کے ذریعے سے اس کی اصلاح کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ توبہ سے غفلت کے باوجود اللہ تعالیٰ کسی کو معاف کر دے یا اس کے گناہوں کے بقدر اس کو سزا دے کر رہائی دے، لیکن جب نہایت واضح تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی ایک شخص کسی حکم کی خلاف ورزی پر اصرار کیے چلا جا رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کے اس حکم کا منکر ہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ ایمان کا بھی دعویٰ کرتا ہے تو یہ محض ایک منافقانہ قسم کی حرکت ہے جو اس عالم الغیب سے مخفی نہیں ہے جو دلوں کے تمام بھیدوں سے بخوبی واقف ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ یعنی ان کو جہنم کے اس دائمی عذاب میں جھونک دے گا جو کفار و منافقین کے لیے مقرر ہے۔

گناہ کا احاطہ دائمی عذاب کا موجب ہے

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایک چیز تو ہے کسی جرم کا مرتکب ہونا اور ایک چیز ہے کسی جرم کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا۔ جو جرم اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے وہ مجرم کی زندگی کے کسی ایک ہی پہلو کو متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کی زندگی کا ہر پہلو اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ اس کا ظاہر، اس کا باطن، اس کا عقیدہ، اس کا عمل اور اس کا ایمان و اسلام سب اس جرم کی چھاپ قبول کر لیتا ہے۔ اس حالت کو قرآن نے 'احاطہ' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے دائمی عذاب نار ہے، مثلاً ارشاد ہے۔ بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ ۔ ۸۱) (البتہ جس نے کوئی بدی کمائی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔)

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲۷۶-۲۷۷)

'محق' کے معنی گھٹانے اور مٹانے کے ہیں۔ اسی سے 'محق اللہ الشیئ' نکلا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے اس چیز کی برکت مٹا دی۔ 'ارباء' کے معنی بڑھانے اور زیادہ کرنے کے ہیں۔

سود کی بے برکتی اور صدقات کی برکت

مطلب یہ ہے کہ سود خور تو یہ سمجھتا ہے کہ سود سے سرمایہ بڑھتا اور خیرات سے گھٹتا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ یہ گھٹانا اور بڑھانا دنیوی زندگی کے محدود تصور کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کی مجموعی زندگی کے لحاظ سے ہے۔ جب اخروی زندگی کی صبح ہو گی تو سود خور دیکھے گا کہ دنیا کے بنک میں تو اس کے لاکھوں روپے جمع تھے لیکن خدا کے بنک میں اس کی ایک کوڑی بھی نہیں ہے، صرف حسرت و ندامت ہی اس کا سرمایہ ہے۔ برعکس اس کے خدا کی راہ میں انفاق کرنے والا جب اس زندگی میں آنکھ کھولے گا تو دیکھے گا کہ اس کے

خزف ریزوں کے عوض یہاں ابدی قدر و قیمت رکھنے والے جواہرات کے پہاڑ بنے ہوئے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ اس امر کی وضاحت بھی ہے کہ اس گھٹنے اور بڑھنے کا تعلق آخرت ہی کی زندگی سے ہے۔ مثلاً وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا۠ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۳۹۔ روم (اور جو مال تم سود کے لیے دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے مال میں پل کر بڑھے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور یہ جو تم زکوٰۃ دیتے ہو، اس کی رضا طلبی میں، تو یہی لوگ خدا کے ہاں بڑھانے والے ہیں)

احادیث سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صدقہ کو قبول کرتا ہے اور اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے لیتا ہے، پھر وہ اس کی تمہارے لیے اس طرح پرورش کرتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے کی پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ تمہارا دیا ہوا ایک لقمہ خدا کے ہاں احد پہاڑ کی مانند بن جائے گا۔"

اگرچہ سود کے سرمایہ میں کوئی خیر و برکت اس دنیا کی زندگی میں بھی نہیں ہوتی لیکن آیت کا تعلق آخرت ہی کے نتائج و ثمرات سے ہے۔

سود کی بے برکتی کا باعث

'کفار' کے معنی یہاں ناشکرے کے ہیں اور 'اثیم' کے معنی، جیسا کہ ہم دوسری جگہ وضاحت کر چکے ہیں، دوسروں کے حقوق تلف کرنے والے کے ہیں۔ یہ ٹکڑا اس بات کی وضاحت کر رہا ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ سود خور کے سرمایہ کو مٹائے گا۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ناشکرا اور اللہ کے بندوں کے حقوق تلف کرنے والا ہے اور اللہ ان لوگوں کو کبھی دوست نہیں رکھ سکتا جو اس کی ناشکری کرنے والے اور اس کی مخلوق کے حقوق تباہ کرنے والے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی ضرورت سے زیادہ مال دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ وہ خدا کا شکرگزار بندہ بنے اور جس طرح اللہ نے اس کے اوپر احسان فرمایا ہے اسی طرح وہ دوسروں پر احسان کرے لیکن جب وہ مال کو پا کر اس مال ہی کی بندگی میں لگ جاتا ہے اور دوسروں کے لیے سہارا بنانے کے بجائے اس کو ان کا خون چوسنے اور ان کے حقوق تلف کرنے کا ذریعہ بنا لیتا ہے تو ایسا قسی القلب اور ناشکرا اسی بات کا سزاوار ہے کہ اللہ کے ہاں اس کی دولت صرف موجب وبال و خسران ہو، اور محرومی کے سوا اس کے پلے کچھ نہ پڑے۔

اس کے بعد اہل ایمان کے عظیم اجر و ثواب کا ذکر فرمایا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اشارہ ان اہل ایمان کی طرف ہے جن کے صدقات میں برکت کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔ اس آیت کے تمام اجزاء کی تشریح مختلف مقامات میں گزر چکی ہے، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۲۷۸)

سودی کاروبار پر آخری ضرب

اس آیت میں اہل ایمان کو براہ راست خطاب کر کے اللہ سے ڈرتے رہنے اور سود کا جو حصہ قرضداروں کے ذمہ ابھی باقی تھا اس سے بالکل دستبردار ہو جانے کی ہدایت فرمائی اور اس کو ایمان کا لازمی تقاضا ٹھہرایا۔ اس سے پہلے سود سے متعلق جو آیات نازل ہوئی تھیں ان کی نوعیت نصیحت و موعظت کی تھی اور ان کی بنیاد اس امر پر تھی کہ آسمانی مذاہب اور دنیا کے معروف میں اس کی حیثیت ہمیشہ سے ایک حرام یا کم از کم ایک مکروہ شے کی رہی ہے۔ اہل عرب اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے مکی دور ہی سے اس کا ظلم ہونا واضح کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ اسی پہلو سے اس کا ذکر سورۂ روم میں بھی ہوا ہے اور وہ ایک مکی سورہ ہے لیکن چونکہ اس کی نوعیت ایک وسیع معاشی فساد کی تھی جس کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہیں تھی کہ ملک کا پورا نظام عملاً اسلام کے زیر اقتدار ہو اس وجہ سے اس پر آخری ضرب حجۃ الوداع کے موقع پر لگائی گئی۔ یہ آیتیں اسی موقع پر نازل ہوئیں اور مضمون کی مناسبت کی وجہ سے ان کو ترتیب میں یہاں جگہ دی گئی۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲۷۹)

سودخواروں کو الٹی میٹم

اس کی نوعیت بالکل الٹی میٹم کی ہے یعنی اب جو لوگ اس حکم کو نہ مانیں گے وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جائیں۔ سود کے متعلق جو لب ولہجہ ان آیات کا ہے بعینہ یہی لہجہ سود سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع میں معلوم ہوتا ہے جس سے ان آیات کے زمانۂ نزول کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس آیت سے صریح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی نظام میں سودی کاروبار کرنے والوں کی حیثیت باغیوں اور مفسدوں کی ہے جن کی سرکوبی کے لیے عندالضرورت فوجی کارروائی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

اس الٹی میٹم کے بعد سودی کاروبار رکھنے والوں کو صرف اس امر کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنی اصل رقمیں قرض داروں سے واپس لے سکتے ہیں، نہ وہ اس میں کسی چال سے سود کی کوئی رقم جوڑ کر قرض دار کی حق تلفی کی راہ ڈھونڈھیں اور نہ قرض داروں کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ اس اصلاح سے فائدہ اٹھا کر مہاجنوں کی اصل رقمیں بھی دبا بیٹھنے کی کوشش کریں۔ یہ تنبیہ اس لیے ضروری ہوئی کہ جب کوئی اہم معاشرتی اور معاشی اصلاح عمل میں آتی ہے تو اس سے متاثر ہونے والے طبقات میں بڑی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ جن کو اس اصلاح سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے وہ ایسی تدبیریں اور ایسے حیلے اختیار کرتے ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو نقصان سے بچالے جائیں اور جنھیں فائدہ پہنچنے کی توقع ہوتی ہے وہ فائدہ کی اسی مقدار پر قناعت نہیں کرنا چاہتے جو انھیں قانون پہنچا رہا ہے بلکہ وہ قانون کی حدود سے آگے بڑھ کر ہاتھ مارنا چاہتے ہیں۔ اس افراتفری اور کشاکش کو روکنے کے لیے قرآن نے اول تو اس کے لیے

بہت پہلے سے، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، ذہنوں کو تیار کیا، پھر جب آخری حکم دیا تو اس کے ساتھ یہ ہدایت
فرما دی کہ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ اسی ہدایت کی یہ برکت تھی کہ عرب میں یہ عظیم معاشی اصلاح بغیر کسی
طبقاتی کش مکش کے عمل میں آ گئی۔ نہ مہاجنوں پر کوئی آفت آئی نہ قرضداروں کو کوئی گزند پہنچا بلکہ دونوں اس
اصلاح کی برکت سے یکساں طور پر مستفید ہوئے۔ اگر بات کے اپنے حدود سے آگے بڑھ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا
تو یہاں ہم دکھاتے کہ دنیا میں دوسری قوموں کو اس قسم کی اصلاحات کے لیے کیا کیا قیمتیں دینا پڑی ہیں۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۸۰-۲۸۱)

اوپر مہاجنوں کو یہ اجازت جو دی ہے کہ وہ اپنی اصل رقم قرضداروں سے واپس لے سکتے ہیں، اس
کے ساتھ ان کو یہ ہدایت دی کہ اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اس کو ہاتھ کشادہ ہونے تک مہلت دو، اور اگر ایسی
حالت میں اپنی اصل رقم بھی معاف کر دو تو یہ بہت بہتر ہے، اس کا اجر و ثواب بے پایاں ہے۔

حامیانِ سود کا ایک دعویٰ اور اس کا جواب

اس زمانے میں بعض کم سواد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں زمانہ نزول قرآن سے پہلے جو سود رائج
تھا یہ صرف مہاجنی سود تھا۔ غریب اور نادار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لیے مہاجنوں
سے قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے اور یہ مہاجن ان مظلوموں سے بھاری بھاری سود وصول کرتے تھے۔ اسی سود
کو قرآن نے ربٰو قرار دیا ہے اور اسی کو یہاں حرام ٹھہرایا ہے۔ رہے یہ تجارتی کاروباری قرضے جن کا اس زمانے
میں رواج ہے تو ان کا اس زمانے میں نہ دستور تھا نہ ان کی حرمت و کراہت سے قرآن نے کوئی بحث کی ہے۔

عرب میں تجارتی قرضوں پر سود لینے کا بھی رواج تھا

ان لوگوں کا نہایت واضح جواب خود اس آیت کے اندر ہی موجود ہے۔ جب قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ
اگر قرض دار تنگ دست (ذُو عُسْرَةٍ) ہو تو اس کو کشادگی (میسرہ) حاصل ہونے تک مہلت دو تو اس آیت
نے گویا پکار کر یہ خبر دے دی کہ اس زمانے میں قرض لینے والے امیر اور مال دار لوگ بھی ہوتے تھے۔ بلکہ یہاں
اگر اسلوب بیان کا صحیح صحیح حق ادا کیجیے تو یہ بات نکلتی ہے کہ قرض لین دین کی معاملت زیادہ تر مال داروں
ہی میں ہوتی تھی۔ البتہ امکان اس کا بھی تھا کہ کوئی قرض دار تنگ حالی میں مبتلا ہو کہ اس کے لیے مہاجن
کی اصل رقم کی واپسی بھی ناممکن ہو رہی ہو تو اس کے متعلق یہ ہدایت ہوئی کہ مہاجن اس کو اس کی مالی حالت
سنبھلنے تک مہلت دے اور اگر اصل بھی معاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ اس معنی کا اشارہ آیت کے الفاظ
سے نکلتا ہے اس لیے کہ فرمایا ہے کہ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (اگر قرض دار تنگ حال ہو
تو اس کو کشادگی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے)۔ عربی زبان میں اِنْ کا استعمال عام اور عادی حالات
کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بالعموم نادر اور شاذ حالات کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔ عام حالات کے بیان کے
لیے عربی میں 'اذا' ہے۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو آیت کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اس زمانہ
میں عام طور پر قرض دار ذُو میسرۃ (خوش حال) ہوتے تھے لیکن گاہ گاہ ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی

کہ قرضدار غریب ہو یا قرض لینے کے بعد غریب ہو گیا ہو تو اس کے ساتھ اس رعایت کی ہدایت فرمائی۔
یوں تو اس تفسیر میں جو کچھ بھی میں لکھ رہا ہوں سب استاذ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا فیض ہے لیکن خاص اس آیت سے متعلق ان کے اپنے الفاظ بھی مجھے مل گئے ہیں جو کم از کم آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ان کے قلم سے نکلے ہیں جب سود کے مسئلہ میں معترضین کی یہ موشگافیاں نہیں پیدا ہوئی تھیں جو اب پیدا ہو گئی ہیں۔ اس وقت مولینا نے بالکل غیر جانبدارانہ ذہن کے ساتھ، مجرد قرآن کے الفاظ سے جو رائے اس مسئلہ پر قائم فرمائی تھی وہ یہ ہے۔

"وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ	وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ الآیۃ کے الفاظ سے
وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ۔ فیلوح	یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اہل عرب خوش حالوں
من هذه الكلمات انهم كانوا ياخذون	سے بھی سود لیتے تھے۔ پھر قریش تاجر لوگ تھے
الربٰو من ذی میسرۃ والقریش کانت	اور سودی بیوپار ان میں رائج تھا۔ اس وجہ سے
تجارا و اصحاب الربٰو فلا ادری فرقا بین	اس معاملے میں ان کے اور ہمارے حالات کے
حالهم وحال ابناء زماننا فی الربٰو،	درمیان کوئی خاص فرق مجھے درباب سود نظر
واللہ اعلم بالصواب۔	نہیں آتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ظاہر ہے کہ مالدار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی کے لیے مہاجنوں کی طرف رجوع نہیں کرتے رہے ہوں گے بلکہ وہ اپنے تجارتی مقاصد ہی کے لیے قرض لیتے رہے ہوں گے۔ پھر ان کے قرض اور اس زمانے کے ان قرضوں میں جو تجارتی اور کاروباری مقاصد سے لیے جاتے ہیں کیا فرق ہوا؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَـيْــــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىھُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْـــَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْھَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۸۲)

'املاء' اور 'املال' کا مفہوم

اس آیت میں کوئی خاص لفظی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ لفظ املال کے معنی وہی ہیں جو 'املاء' کے ہیں، یعنی لکھوانے کے۔ قرآن نے ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے اور یقیناً ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔ میں نے ان دونوں کے مادے اور مشتقات پر جہاں تک غور کیا ہے اس سے میرا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ لکھوانے کے معنی میں اصل لفظ تو 'املاء' ہی کا ہے لیکن صوتی مشابہت کی وجہ سے 'املال' بھی اس معنی میں استعمال ہونے لگا ورنہ بجائے خود املال کے مادے میں لکھنے یا لکھانے کے مضمون کے لیے کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ صوتی مشابہت کی بنا پر ایک مادے سے دوسرے مادے کی طرف الفاظ کے منتقل ہو جانے کی عربی زبان میں بکثرت مثالیں موجود ہیں لیکن اس قسم کی تفصیلات میں ہمارے لیے زیادہ گھسنے کی گنجائش نہیں ہے۔

'فُسُوقٌ بِكُمْ' کا مفہوم

آیت کے آخر میں لفظ 'فسوق' کے ساتھ جو 'بکم' کا لفظ آیا ہے اس میں 'ب' کا تعلق 'فسوق' کے ساتھ بعض لوگوں کو بیگانہ سا محسوس ہوگا۔ ایسے لوگوں کو عربی زبان کا یہ اسلوب یاد رکھنا چاہیئے کہ جب صلہ اور اس کے متعلق میں بیگانگی ہو تو وہاں کوئی ایسا لفظ محذوف مان لیتے ہیں جو اس صلہ سے موافقت رکھنے والا ہو۔ یہاں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'فسوق' کے بعد کوئی لفظ لازم ہو جانے اور چپک جانے کے مفہوم کا محذوف ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم نے فلاں بات کی تو یہ تمہاری طرف سے ایسے فسق کا ارتکاب ہوگا جو تمہارے ساتھ چپک کے رہ جائے گا، اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔

قرض لینے والوں اور دینے والوں کو نقصان اور نزاع سے بچانے کے لیے ہدایات

یہاں سودی قرضوں کے سلسلے کو یک قلم ختم کرنے کے بعد قرض دینے والوں اور قرض داروں دونوں کو نزاع اور نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل ہدایات دی ہیں:۔

(ا) جب کوئی قرض لین دین ایک خاص مدت تک کے لیے ہو تو اس کی دستاویز لکھ لی جائے۔

(ب) یہ دستاویز دونوں پارٹیوں کی موجودگی میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے، اس میں کوئی دخل فصل نہ کرے اور جس کو لکھنے کا سلیقہ ہو اس کو چاہیئے کہ وہ اس خدمت سے انکار نہ کرے۔ لکھنے کا سلیقہ اللہ کی ایک نعمت ہے، اس نعمت کا شکریہ ہے کہ آدمی ضرورت پڑنے پر لوگوں کے کام آئے اس نصیحت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس زمانے میں لکھے پڑھے لوگ کم تھے۔ دستاویزوں کی تحریر اور ان کی رجسٹری کا سرکاری اہتمام اس وقت تک نہ عمل میں آیا تھا اور نہ اس کا عمل میں آنا ایسا آسان تھا۔

(ج) دستاویز کے لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے پر ہوگی۔ وہ دستاویز میں اعتراف کرے گا کہ میں فلاں بن فلاں کا اتنے کا قرضدار ہوں اور لکھنے والے کی طرح اس پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اس اعتراف میں تقویٰ کو ملحوظ رکھے اور ہرگز صاحب حق کے حق میں کسی قسم کی کمی کرنے کی کوشش نہ کرے۔

(د) اگر یہ شخص کم عقل ہو یا ضعیف ہو یا دستاویز وغیرہ لکھنے لکھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو جو اس کا ولی یا وکیل ہو وہ اس کا قائم مقام ہو کر انصاف اور سچائی کے ساتھ دستاویز لکھوائے۔

(و) اس پر دو مردوں کی گواہی ثبت ہوگی جن کے متعلق ایک ہدایت یہ ہے کہ وہ مِنْ رِّجَالِكُمْ یعنی اپنے مردوں میں سے ہوں۔ جس سے بیک وقت دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمان ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے میل جول اور تعلق کے لوگوں میں سے ہوں کہ فریقین ان کو جانتے پہچانتے ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ یعنی پسندیدہ اخلاق و عمل کے ثقہ، معتبر اور ایماندار ہوں۔

(ز) اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسّر نہ آسکیں تو اس کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اس لیے ہے کہ اگر ایک سے کسی لغزش کا صدور ہو گا تو دوسری کی تذکیر و تنبیہ سے اس کا سدِ باب ہو سکے گا۔ یہ فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں ہے بلکہ اس کی مزاجی خصوصیات اور اس کے حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمہ داری اس کے لیے ایک بھاری ذمہ داری ہے اس وجہ سے شریعت نے اس کے اٹھانے میں اس کے لیے سہارے کا بھی انتظام فرما دیا ہے۔ یہ موضوع اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ سورہ نساء میں زیرِ بحث آئے گا۔

(ذ) جو لوگ کسی دستاویز کے گواہوں میں شامل ہو چکے ہوں، عند الطلب ان کو گواہی سے گریز کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے کہ حق کی شہادت ایک عظیم معاشرتی خدمت بھی ہے اور شہداء اللہ ہونے کے پہلو سے اس اُمّت کے فریضۂ منصبی کا ایک جزو بھی۔

(ح) قرض لین دین کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اگر وہ کسی مدّت کے لیے ہے، دست گرداں نوعیت کا نہیں ہے، تو اس کو قیدِ تحریر میں لانے سے گرانی نہیں محسوس کرنی چاہیئے۔ جو لوگ اس کو زحمت سمجھ کر ٹال جاتے ہیں وہ سہل انگاری کی وجہ سے بسا اوقات ایسے جھگڑوں میں پھنس جاتے ہیں، جن کے نتائج بڑے دور رس نکلتے ہیں۔

(ط) مذکورہ بالا ہدایات اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق و عدالت سے قرین، گواہی کو درست رکھنے والی اور شک و نزاع سے بچانے والی ہیں اس لیے معاشرتی صلاح و فلاح کے لیے ان کا اہتمام ضروری ہے۔

(ی) دست گرداں لین دین کے لیے تحریر و کتابت کی پابندی نہیں ہے۔

(ک) ہاں اگر کوئی اہمیت رکھنے والی خرید و فروخت ہوئی ہے تو اس پر گواہ بنا لینا چاہیئے تاکہ کوئی نزاع پیدا ہو تو اس کا تصفیہ ہو سکے۔

(ل) نزاع پیدا ہو جانے کی صورت میں کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی فریق کے لیے جائز نہیں ہے۔ کاتب اور گواہ ایک اہم اجتماعی و تمدنی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو بلا وجہ نقصان پہنچانے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ثقہ اور محتاط لوگ گواہی اور تحریر وغیرہ کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے لگیں گے اور لوگوں کو پیشہ ور گواہوں کے سوا کوئی معقول گواہ ملنا مشکل ہو جائے گا۔ اس زمانے میں ثقہ اور سنجیدہ لوگ گواہی وغیرہ کی ذمہ داریوں سے جو بھاگتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے

کہ کوئی معاملہ نزاعی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس کے گواہوں کی شامت آجاتی ہے۔ یہ بے چارے ہتک، اغوا اور نقصانِ مال و جان، دبلکہ قتل تک کی تعدیوں کے نشانہ بن جاتے ہیں۔ قرآن نے اس قسم کی شرارتوں سے روکا کہ جو لوگ اس قسم کی حرکتیں کریں گے وہ یاد رکھیں کہ یہ کوئی چھوٹی موٹی نافرمانی نہیں ہے جو آسانی سے معاف ہو جائے گی بلکہ یہ ایک ایسا فسق ہے جو ان کے ساتھ چمٹ کے رہ جائے گا اور اس کے بُرے نتائج سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ یہ اس شہادت کی بنیاد کو ڈھانے کی کوشش ہے جو اس اُمت کی بعثت کی اصل غایت ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا نافرمانیوں پر فوراً نہیں پکڑا کرتا۔ لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس سے چھوٹ نہیں سکتا۔ پھر فرمایا کہ "اللہ تمھیں تعلیم دے رہا ہے" جس میں سرتاسر تمھارا اپنا ہی نفع ہے اور وہی ہے جو ساری باتوں سے واقف ہے اس وجہ سے اسی کو تعلیم و ہدایت دینے کا حق پہنچتا ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۲۸۳)

رہانِ مقبوضہ کا مفہوم

'رہان' 'رہن' کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ شے ہے جو قرض دینے والے کے قرض کی ضمانت کے طور پر اس کے قبضے میں کرا دی جائے۔ 'فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ' بالکل اسی طرح کا جملہ ہے جس طرح سورۂ یوسف میں 'فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ' ہے۔ اس کو مبتدا مان کر اس کی خبر کو محذوف بھی قرار دے سکتے ہیں اور اس کو خبر مان کر اس کے مبتدا کو محذوف بھی مان سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر لکھا پڑھی اور گواہی شہادت کی صورت مفقود ہو تو کوئی چیز بطور رہن قبضے میں کرا کے بھی قرض کی معاملت کی جا سکتی ہے۔

"امن فلان فلانا" کے معنی یہ ہیں کہ فلاں شخص اپنے آپ کو فلاں کی طرف سے خطرے سے محفوظ سمجھتا ہے، اس کی طرف سے مامون ہے، اس پر اعتماد کرتا ہے۔

'اثم' 'قلبہ' کی حقیقت

'اٰثِمٌ قَلْبُهٗ' (اس کا دل آلودۂ گناہ ہے) اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر انسان کے محض ظاہری اعضا ہی تک محدود رہتا ہے، اس کی نوعیت بس اوپری گرد و غبار کی ہوتی ہے، مثلاً لغو قسمیں جو بے مقصد کھائی جاتی ہیں۔ اس طرح کے گناہ یا تو انسان کی روزمرہ کی معمولی نیکیوں سے آپ سے آپ جھڑ جاتے ہیں یا معمولی توجہ سے ان کی اصلاح ہو جایا کرتی ہے۔ دوسرے گناہ وہ ہوتے ہیں جن کی تحریک دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے۔ ایسے گناہوں کے اثرات بھی دل تک متعدی ہوتے ہیں۔ گناہ کی یہ قسم خطرناک ہے، یہ دل کے فساد کی غمازی کرتی ہے۔ اگر اس سے احتیاط نہ کی جائے یا صادر ہو جانے کے بعد فوراً اس کی اصلاح کی کوشش نہ کی جائے تو اس کے جڑ پکڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اوپر ہم احاطہ کرنے والے گناہ اور چمٹ جانے والے فسق پر گفتگو کر چکے ہیں اس کو نگاہ میں رکھیے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ شہادت

کو چھپانا اسی نوعیت کا گناہ ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہے کہ شہادت علی الناس اس امت کا وہ اصل فریضہ منصبی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو مامور فرمایا ہے اس وجہ سے اس سلسلے کی ہر کوتاہی بڑے دور رس نتائج کی حامل ہے۔

رہن کے احکام

اس آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر حالتِ سفر میں قرض لین دین کی ضرورت پیش آن پڑے اور تحریر و شہادت کا اہتمام ممکن نہ ہو اور قرض دینے والا بغیر کسی ضمانت کے قرض دینے پر آمادہ نہ ہو تو یہ شکل بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ کوئی چیز بطور رہن اس کے قبضے میں کرا دی جائے۔ لیکن یہ شکل صرف اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک قرض دینے والے کے لیے اطمینان و اعتماد کی صورت نہیں پیدا ہو جاتی۔ جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک دوسرے پر اعتماد کے لیے جو باتیں مطلوب ہیں وہ فراہم ہو جائیں، مثلاً سفر ختم کر کے حضر میں آ گئے، دستاویز کی تحریر کے لیے کاتب اور گواہ مل گئے، انہوں کی موجودگی میں قرض معاملت کی تصدیق ہو گئی اور اس امر کے لیے کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہ گئی کہ قرض دینے والا رہن کے بغیر اعتماد نہ کر سکے تو پھر اس کو چاہیئے کہ وہ رہن کردہ چیز اس کو واپس کر دے اور اپنے اطمینان کے لیے چاہے تو وہ شکل اختیار کرے جس کی اوپر ہدایت کی گئی ہے۔ یہاں رہن کردہ مال کو امانت سے تعبیر فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرض دینے والے کے پاس رہن بطور امانت ہوتا ہے جس کی حفاظت ضروری اور جس سے کسی قسم کا انتفاع ناجائز ہے۔

مجاہدؒ اور ضحاکؒ کے متعلق تفسیروں میں منقول ہے کہ یہ حضرات رہن کو سفر کے ساتھ مخصوص مانتے تھے۔ مجھے ان کی یہ رائے قوی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جب اعتماد کرنے کے لیے وجوہ و اسباب موجود ہوں تو رہن پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے کوئی وجہ باقی نہیں ہی یہ امانت، امانت رکھنے والوں کو لوٹا دینی چاہیئے۔ بالخصوص جب معاملہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو تب تو یہ چیز نہ صرف اسلامی اخوت و مروت کے خلاف ہے بلکہ یہ ایک قسم کی دناءت بھی ہے۔ جب ایک شخص دستاویز اور گواہی کی ضمانتیں حاصل کر سکتا ہے تو یہ بات نہایت بھونڈی ہے کہ وہ اپنے قرض کی ضمانت میں قرض دار کا مکان، یا اس کا کھیت، یا اس کا باغ، یا اس کا گھوڑا، یا اس کی بکری یا اس کے بیوی بچوں کے پہننے کے زیور اور کپڑے اپنے قبضہ میں رکھے۔

رہن سے متعلق حدیث کی توجیہ

ہمیں اس روایت سے انکار نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس کچھ جَو کے بدلے رہن رکھی۔ لیکن اس سے جو بات زیادہ سے زیادہ نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کو کسی شدید مجبوری کے سبب سے کسی بنیے یا یہودی سے قرض لینے کی نوبت آ جائے اور وہ رہن کے سوا کسی اور صورت پر معاملہ کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ اور بہت کھینچ تان کی جائے تو اس سے یہ بات بھی نکالی جا سکتی ہے کہ کسی تنگ دل مسلمان سے بھی بدرجہ

مجبوری اس طرح معاملہ کیا جا سکتا ہے لیکن عام مسلمانوں کے لیے جب باہمی معاملت کی ایک واضح اتمامِ اعتماد اور اسلامی اخوت و مروت کے تقاضوں کے مطابق ایک شکل بیان کر دی گئی ہے تو اس کے ہوتے ہوئے کس طرح اس کو پسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ بلا کسی مجبوری کے بھی وہ رہن پر قرض لین دین کریں۔ یہ بات قرآن کی اس آیت کے تو بالکل خلاف ہے، رہی حدیث تو اس سے بھی رہن کے عام جواز پر استدلال کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ ایک تو یہ معاملہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک یہودی کے ساتھ ہوا۔ دوسرے صورتِ واقعہ صاف گواہی دے رہی ہے کہ یہ بہت مجبوری کی صورت میں ہوا۔

زیرِ بحث آیت میں مفسرین نے عام طور پر امانت سے وہ قرض مراد لیا ہے جو کوئی شخص کسی کو بغیر رہن کے مجرد اعتماد پر دے دے۔ لیکن قرض کے لیے امانت کی تعبیر گوناگوں پہلوؤں سے ہمارے نزدیک غلط ہے۔ اصل میں یہ حضرات چونکہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ سفر ختم ہو جانے کے بعد جب اعتماد و اطمینان کی شکل پیدا ہو جائے تو رہن واپس کر دینا چاہیے اس وجہ سے انہیں امانت کی تاویل میں یہ تکلف کرنا پڑا لیکن ہم نے جو تاویل کی ہے اس میں آیت و حدیث دونوں کا محل الگ الگ معین ہو گیا ہے اس وجہ سے نہ اس تکلف میں پڑنے کی ضرورت باقی رہی اور نہ اس کی تردید میں دلائل جمع کرنے کی ضرورت باقی رہی۔

۸۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۸۴-۲۸۶

اب یہ عظیم سورہ ختم ہو گئی۔ آگے کی آیات بطور خاتمہ ہیں۔ اس خاتمہ میں پہلے تو تنبیہ ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کی ملکیت اور اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ بندوں کے تمام ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ وہ ہر چیز کا حساب کرے گا اور اپنے اختیارِ مطلق سے جس کو مغفرت کا سزاوار قرار دے گا اس کی مغفرت فرمائے گا اور جس کو سزا کا مستحق پائے گا اس کو سزا دے گا، کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے ارادے اور فیصلے میں مداخلت کر سکے۔

دین کی یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کا صحیح شعور اس امانت کا اہل بناتا ہے جو اس سورہ میں امتِ مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو فراموش کر دینے کے سبب سے یہود اور نصاریٰ اس امانت کی سعادتوں سے محروم ہوئے۔ اس اہمیت کی وجہ سے جس طرح جگہ جگہ اس سورت میں اس کی یاددہانی کی گئی ہے اسی طرح خاتمہ پر بھی اس کی یاددہانی فرمائی۔

اس کے بعد فرمایا کہ اللہ کے رسول اور اس کے ایمان لانے والے بندوں نے اس چیز کو قبول کر لیا ہے جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔ یہی اس پر ایمان لانے کے سزاوار تھے۔ یہ یہود و نصاریٰ کی طرح خدا کے نبیوں اور رسولوں کے باب میں کسی تعصب میں مبتلا نہ تھے کہ کسی کو مانیں، کسی کو نہ مانیں اس وجہ سے اللہ نے ان کے لیے ہدایت کی راہ کھولی اور وہ فائز المرام ہوئے۔ رہے وہ لوگ جو تعصبات کے پھندوں

میں گرفتار ہیں تو اللہ کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ وہ جس وادی میں چاہیں بھٹکتے پھریں۔ اپنا انجام خود دیکھیں گے۔

اس کے بعد وہ عظیم دعا نمودار ہوتی ہے جو اس امت کے ہر فرد کی صدائے حال ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے اس بھاری ذمہ داری کا احساس بھی ٹپک رہا ہے جو اس امت پر ڈالی گئی ہے، وہ اعتراف بھی نمایاں ہو رہا ہے جو روحِ ایمان ہے، ان باتوں سے بچائے جانے کی التجا بھی جھلک رہی ہے جو پچھلی امتوں کے لیے ٹھوکر کا باعث ہوئیں اور ادائے فرض کی راہ میں جن مشکلات کے اندیشے ہیں ان میں استعانت اور جن لغزشوں کے خطرے ہیں ان سے درگزر کی درخواست بھی ہے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸۴-۲۸۶

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؀۲۸۴ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ؀۲۸۵ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ؀۲۸۶

ترجمۂ آیات ۲۸۴-۲۸۶

جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے۔ جو کچھ تمہارے دلوں

میں ہے اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، خدا اس کا تم سے حساب لے گا، پھر جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۸۴

رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین ایمان لائے۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ان کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔ اے پروردگار! ہم تیری مغفرت کے طلبگار ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر ایک پائے گا جو کمائے گا اور بھرے گا جو کرے گا۔ اے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہم سے مواخذہ نہ فرمانا۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ لاد جس کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہمیں معاف کر، ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما، تو ہمارا مولیٰ ہے، پس کافروں کے مقابل میں ہماری مدد کر۔ ۲۸۵-۲۸۶

۸۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۸۴)

"جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے"۔ یہ جملہ اپنے اندر بیک وقت تین مفہوم رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر چیز خدا ہی کی ملکیت ہے، دوسرا یہ کہ ہر چیز اسی کے اختیار و تصرف میں ہے، تیسرا یہ کہ بالآخر ہر چیز کا مرجع خدا ہی ہے۔ اردو میں کوئی ایسا ترجمہ اس کا جو ان تینوں مفہوموں کو بیک وقت اٹھالے میری سمجھ میں نہیں آیا۔

دل کی پوشیدہ باتوں کے محاسبے کا مفہوم

اِنْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ، دل کی پوشیدہ باتوں کا محاسبہ کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ دل میں جو خیالات اور وسوسے گزرتے رہتے ہیں ان کا بھی محاسبہ ہوگا بلکہ اس سے صرف وہ عزائم مراد ہیں جو مضبوط ارادے کے ساتھ دل میں موجود ہیں لیکن کسی مجبوری یا مزاحمت کے سبب سے وہ ظاہر نہ ہو سکے یا عمل میں نہ آسکے۔ مثلاً ایک شخص اگر کسی کے قتل کا دل میں پختہ ارادہ رکھتا ہے تو ہر چند کسی خوف یا مجبوری کے سبب سے اس کا ارادہ بروئے کار نہ آسکے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس ارادے پر اس کی پکڑ ہوگی۔

خدا کی مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ الاية۔ اور اس طرح کی دوسری آیات میں، جیسا کہ ہم بار بار اپنی اس کتاب میں واضح کر چکے ہیں، اصل زور جس بات پر ہوتا ہے وہ اس پر ہوتا ہے کہ خدا کی مشیت میں کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں ہے اور مقصود اس سے شرک کی نفی ہوتی ہے۔ یہ مقصد نہیں ہوتا ہے کہ خدا کی اس مشیت کے لیے سرے سے کوئی ضابطہ و قاعدہ ہی نہیں ہے۔ خدا کی ہر مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے، چنانچہ یہ مغفرت اور عذاب کا معاملہ بھی اسی ضابطۂ حکمت کے تحت عمل میں آئے گا جو اس کے لیے اس نے مقرر فرما رکھا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی اور کے لیے اس میں کسی مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔

آیت ۲۸۴ کا دوگونہ ربط

اس پوری آیت کے موقع و محل پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک پہلو سے تو اپنے ماسبق سے مربوط ہے اور دوسرے پہلو سے یہ سورہ کے خاتمہ کی نہایت جامع اور مؤثر تمہید ہے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا تھا کہ شہادت کو نہ چھپاؤ، جو شہادت کو چھپاتا ہے اس کا دل آلودۂ معصیت ہو جاتا ہے۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔" اب اس کے ساتھ اگر یہ مضمون لگا دیجیے کہ "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے، اللہ تمہارے ظاہر و باطن سب کا محاسبہ کرنے والا ہے، پھر جس کو چاہے گا وہ بخشے گا اور جس کو چاہے گا، عذاب دے گا" تو گویا بات پوری طرح مدلل بھی ہو گئی اور مکمل بھی۔ یہ آیت کا ربط ماسبق سے ہوا۔

آگے سے اس کا ربط، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ یہ توحید کی آیت ہے۔ احکام و قوانین کے باب میں جس طرح نماز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اسی طرح عقائد کے باب میں توحید کو اساس دین کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ یاد ہوگا کہ جہاں سے اس سورہ میں امت کے لیے تعلیم شریعت کا باب شروع ہوا ہے وہاں سب سے پہلے توحید کا بیان ہوا ہے اس کے بعد نماز کا۔ اب خاتمے پر امت کو کامل حوالگی اور سپردگی کی تعلیم دینے کے لیے توحید کی پھر یاد دہانی کی اور یاد دہانی کا انداز تعلیم سے زیادہ تنبیہ کا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ امت اس امانت کی گراں باریوں کو سمجھے اور غلط سہاروں پر اعتماد کرنے کے بجائے صرف اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے آگے جواب دہی کے لیے تیار رہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ق غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (۲۸۵)

ایمان نہ لانے والوں سے بے پروائی

یہاں رسول اور مسلمانوں کے ایمان کی خبر دینے سے مقصود محض ایک واقعے کی خبر دینا نہیں ہے بلکہ قرآن کے مخالفین بالخصوص یہود کی مخالفت سے بے پروائی کا اظہار ہے۔ سورہ کا آغاز، یاد ہوگا، اس بات سے ہوا تھا کہ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے میں تو کسی شبے کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس پر ایمان وہی لوگ لائیں گے جن کے اندر خدا ترسی، حقیقت بینی اور حق طلبی ہوگی۔ جو لوگ گروہ پرستی، عصبیت اور اپنی برتری کے زعم میں مبتلا ہوں گے وہ اس کتاب پر ایمان لانے سے محروم رہیں گے۔ اب یہاں خاتمے پر یہ اعلان فرما دیا کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں نے واضح کر دیا کہ اس ایمان کی سعادت سے بہرہ مند ہونے والے کون لوگ تھے۔ گویا دودھ کے اندر جتنا مکھن تھا وہ نکال کر سامنے رکھ دیا اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر دیا کہ اس دودھ کے اندر یہ مکھن تھا جو نکل آیا ہے۔ اب جو بچ رہا ہے یہ چھاچھ ہے خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

قانون کی فرمانبرداری کے معاملے میں نبی اور امتی یکساں ہیں

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ کتاب الٰہی پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے جس کا ذکر ہوا ہے وہ خود رسول کی ذات ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں قانون کی فرمانبرداری اور اطاعت کے معاملے میں پیغمبرؐ بھی اسی سطح پر ہے جس پر عام اہل ایمان ہیں۔ دنیوی بادشاہ اپنی رعایا کو جو قانون دیتے ہیں وہ خود اس قانون سے بالاتر ہوتے ہیں لیکن خدا کے قانون میں خود اس قانون کا لانے والا نہ صرف یہ کہ اس کے تحت ہوتا ہے بلکہ اسے سب سے آگے بڑھ کر اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اور اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کہتے ہوئے اس کا قلاوہ اپنی گردن میں ڈالنا پڑتا ہے۔ یہ ان پیغمبروں کی سچائی کی ایک ایسی شہادت ہے جس کو صرف ایک ہٹ دھرم ہی جھٹلا سکتا ہے۔

اجمالی ایمان تمام انبیاء اور تمام صحیفوں پر

کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ الاٰیۃ میں جن اجزائے ایمان کا ذکر ہوا ہے ان پر ہم اسی سورہ کی آیت ۱۷۷ کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں اللہ، فرشتوں، کتابوں اور نبیوں پر ایمان کی حقیقت سمجھنی چاہیے۔ خاص طور پر فرشتوں پر ایمان کی ضرورت ہم نے وہاں تفصیل سے واضح کی ہے۔ البتہ ایک بات کی طرف یہاں بھی اشارہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہاں کتاب کا لفظ ہے، یہاں کتاب کے بجائے کُتُب کا لفظ ہے جو کتاب کی جمع ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے لیے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اہل کتاب صرف اپنی کتاب اور صرف اس نبی یا ان نبیوں پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں جن کو وہ اپنے یا اپنا نبی خیال کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے یہ امت اللہ کے تمام نبیوں اور تمام کتابوں پر ایمان رکھتی ہے۔ جہاں تک اجمالی ایمان کا تعلق ہے ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء، قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

البتہ چونکہ دوسرے انبیا اور ان کے صحیفوں کی تعلیم محفوظ نہیں رہی نیز ان صحیفوں اور ان انبیا نے خود خبر دی تھی کہ ان کی شریعت کامل نہیں ہے، کامل شریعت قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دنیا کو ملے گی، اس وجہ سے ہم قرآن اور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف اجمالی نہیں بلکہ تفصیلی ایمان بھی رکھتے ہیں اور اسی تفصیلی ایمان کی دعوت دنیا کو بھی دیتے ہیں۔

اسلوب کی تبدیلی میں بلاغت کا نکتہ

'لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ' اس ٹکڑے کی شرح ہم اسی سورہ کی آیت ۱۳۵ کے تحت 'امت وسط' کے کلمہ کی وضاحت کرتے ہوئے کر چکے ہیں۔ البتہ اس میں یکایک اسلوب کی جو تبدیلی ہوئی ہے یعنی بات غائب کے صیغے سے نکل کر جو متکلم کے صیغے میں آگئی ہے، یہ دھیان میں رکھنے کی ہے۔ اوپر کے ٹکڑے میں بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہی گئی ہے لیکن یہ جملہ براہ راست امت کی طرف سے اعتراف و اظہار کی شکل میں نمایاں ہوا ہے۔ اس میں بلاغت کا یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اوپر کے ٹکڑے میں مسلمانوں کا جو ایمان و عقیدہ بیان ہوا ہے پوری امت اس کا اقرار و اظہار کرتی ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کے باب میں کسی تعصب میں گرفتار نہیں ہیں، یہ تمام انبیا ایک ہی سلسلۃ الذہب کی کڑیاں ہیں اس وجہ سے ہم یہود و نصاریٰ کی طرح یہ نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو رد کر دیں۔ 'احد' کا لفظ چونکہ جمع کے مفہوم میں آتا ہے، جیسے لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اس وجہ سے اس کے ساتھ لفظ 'بین' کا استعمال صحیح ہے۔

'سمع و طاعت' کا مفہوم

'وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' سمع کا لفظ یہاں مجرد سننے کے معنی میں نہیں بلکہ ماننے اور قبول کرنے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ اردو میں بھی سننے کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں 'سَمِعْنَا' کا لفظ دل کی قبولیت کا اظہار کرتا ہے اور 'اَطَعْنَا' کا لفظ عملی اطاعت کا۔ اور ایمان و اسلام کی اصل حقیقت یہی ہے۔ اس میں یہود کے 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' پر ایک لطیف تعریض بھی ہے۔

حذف فعل کا ایک فائدہ

'غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ' غفرانک فعل محذوف کا مفعول ہے۔ اس طرح کے مواقع میں فعل کا حذف دعا کرنے والے کے اضطراب کو ظاہر کرتا ہے جو قبولیت دعا کے لیے ایک نہایت مؤثر سفارش ہے۔

سمع و طاعت کے اقرار سے دعا کا تعلق

سمع و طاعت کے اقرار کے بعد معاً دعا کا زبان پر جاری ہو جانا اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ اقرار ایک عظیم ذمہ داری کا اقرار ہے، یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے، اس میں بڑی بڑی آزمائشیں پیش آتی ہیں اور ہر قدم پر لغزشوں، کوتاہیوں اور ٹھوکروں کے اندیشے ہیں۔ اس حقیقت کے شعور نے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے اقرار کے فوراً بعد طلب مغفرت کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس لیے کہ جب راہ بھی کٹھن ہے اور پرسش بھی ہر پوشیدہ اور علانیہ پر ہونی ہے جیسا کہ اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے اور عذاب اور رحمت سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے تو اس کی مغفرت کے سہارے کے سوا ہر سہارا بے حقیقت

ہے۔ وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ میں کامل سپردگی ہے، یعنی تیرے سوا کوئی نہیں ہے جو کسی پہلو سے مرجع و ماوی بن سکے۔ اس میں ایک لطیف تعریض یہود و نصاریٰ پر بھی ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد اور شرکا و شفعاء کے اعتماد پر سمع و طاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو بیٹھے۔ لیکن اس امت پر یہ حقیقت واضح ہے کہ سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا، اسی کے آگے پیش ہونا اور اسی کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲۸۶)

دعا کے بیچ میں جملہ معترضہ

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا) یہ دعا کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ ہے اور مقصود اس کے لانے سے اس اہم حقیقت کا اظہار ہے کہ سمع و طاعت کی یہ ذمہ داری جو اس امت پر ڈالی گئی ہے، ہے تو ایک بھاری ذمہ داری، لیکن اس کے بھاری ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت کا یہ پہلو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص بس اسی حد تک مکلّف ہے جس حد تک اس کو طاقت عطا ہوئی ہے، جو چیز اس کے حدود اختیار و امکان سے باہر ہے اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ شریعت نے خود اپنے احکام و قوانین میں اس امر کو ملحوظ رکھا ہے اور مجبوریوں کی صورت میں اس پہلو سے بندوں کو رخصتیں دی ہیں۔ اس وجہ سے نہ تو اللہ کو یہ پسند ہے کہ بندے اپنے آپ کو کسی تکلیف مالایطاق میں ڈالیں اور نہ کسی دوسرے ہی کے لیے یہ جائز ہے کہ ان پر کوئی ایسا بوجھ ڈالے جس کو وہ اٹھا نہ سکتے ہوں۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں سے سمع و طاعت کا عہد لیتے تو از خود یاددہانی کر کے ان سے "تا بہ حد استطاعت" کی شرط لگوا دیتے۔ یہ حضورؐ کی طرف سے اسی آیت کی تعمیل تھی۔ اس میں اہل ایمان کے لیے جو تخفیف اور بشارت ہے وہ بالکل واضح ہے بالخصوص اس موقع پر جب ان پر ایک عظیم شریعت کی ذمہ داریاں ڈالی جا رہی ہیں۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اس کو ملے گا جو اس نے کمایا اور وہ بھگتے گا جو اس نے کیا)۔ یہ بات چونکہ اسی بات کا ایک پہلو ہے جو اوپر گزری ہے اس وجہ سے اسی کے ساتھ اس کو جوڑ دیا ہے، اس سے الگ نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو نفع یا ضرر جو کچھ بھی پہنچے گا اس کے اپنے عمل ہی سے پہنچے گا، کسی اور شے سے نہیں پہنچے گا۔ جو وہ بوئے گا وہی کاٹے گا اور جو کچھ کرے گا وہی بھرے گا۔ نہ دوسرے کے نیک اعمال کا کریڈٹ اس کو ملنے والا ہے اور نہ دوسرے کی بدیاں اس کے کھاتے میں پڑنے والی ہیں۔

اور نہ کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نفس پر ذمہ داری اس کی طاقت اور اس کے اختیار کے پیمانے سے ناپ کر ڈالی ہے۔ اس وجہ سے ہر شخص کی کامیابی اور ناکامی اس ذمہ داری کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ۔

خطا اور نسیان کا فرق اور اس دعا کی حکمت

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا، اوپر والا جملہ معترضہ محض اہل ایمان کی تسلی اور ایک مناسب موقع حقیقت کی یاد دہانی کے لیے تھا۔ اب اصل دعا پھر زبان پر جاری ہو گئی۔ اس ٹکڑے میں نسیان اور خطا پر مواخذہ نہ کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ نسیان تو یہ ہے کہ آدمی سمع و طاعت کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے کوئی چیز بھول جائے اور خطا یہ ہے کہ اپنی ناسمجھی سے کسی کام کو غلط طور پر کر بیٹھے۔ اگرچہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف ہیں لیکن معاف شدہ چیزوں کی معافی کی درخواست بندے کی طرف سے غایت درجہ خشیت کا اظہار ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت کے مزید دروازے کھلتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف تھے، پھر بھی آپ استغفار میں زیادہ سے زیادہ مشقت اٹھاتے تھے۔ جب آپ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا، کیا میں یہ نہ چاہوں کہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنوں!

اصر کا مفہوم اور اس دعا کا رمز

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا، 'اصر' کے اصل معنی عہد اور ذمہ داری کے ہیں مثلاً ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۸۱- آل عمران (کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور ان باتوں کے لیے میری ڈالی ہوئی ذمہ داری تم نے اٹھائی) یہیں سے اس کا استعمال ان بھاری اور گراں ذمہ داریوں اور بوجھوں کے لیے ہوا جن کا اٹھانا دشوار ہو۔ اسی مفہوم میں یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔ یہود کی شریعت میں اس قسم کے اصر اور اغلال جن کی تفصیل سورۂ اعراف کی تفسیر میں آئے گی، موجود تھے اور خاتم الانبیاء، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپ اللہ کی شریعت کو ان بوجھل طوق و سلاسل سے آزاد کر کے اس کو فطرت کی اساس پر قائم کریں گے جیسا کہ ارشاد ہے وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۱۵۷- اعراف (اور ان کے اوپر سے وہ دور کرے گا وہ بوجھ اور وہ طوق جو ان پر پہلے سے ہیں) یہاں دعا کے ان الفاظ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم پر اس قسم کے بوجھ نہ ڈالے جائیں جس قسم کے بوجھ یہود پر ان کی سرکشی کی وجہ سے ڈالے گئے اور جن کو بالآخر وہ اٹھا نہ سکے۔ دعا کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اس امت کے مزاج اور اس کو ملنے والی شریعت کے مزاج میں کامل موافقت ہے۔

طاقت سے باہر آزمائشوں سے بچنے کی دعا

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ، تحمیل کے معنی کسی پر کوئی بھاری بوجھ لادنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس سمع و طاعت کی راہ میں آگے جو آزمائشیں پیش آنے والی ہیں ان میں کوئی آزمائش ایسی نہ ہو جو ہماری برداشت سے زیادہ ہو اور جو ہمیں تیری وفاداری کے امتحان میں ناکام بنا دے۔ جہاں تک

ابتلاء و امتحان کا تعلق ہے وہ تو لازمۂ ایمان و اسلام بلکہ لازمۂ حیات ہے جس سے اس دنیا میں مفر نہیں ہے۔ کھرے کھوٹے میں امتیاز اور بندوں کی صلاحیتوں کے اجاگر ہونے کے لیے اس سے گزرنا ضروری ہے لیکن یہ دعا بندے کو کرتے رہنا چاہیئے کہ کوئی امتحان اس کی طاقت سے زیادہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے امتحان کے معاملے میں اپنی کمزوری و ناتوانی کا اعتراف ہی صحیح رویّہ ہے، جو لوگ اپنے اوپر زیادہ اعتماد کر بیٹھتے ہیں وہ اکثر اس امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ احادیث میں مختلف پہلوؤں سے اس کی ممانعت آئی ہے۔

یہاں اوپر والے ٹکڑے اور اس ٹکڑے کے فرق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اوپر والے ٹکڑے میں تو اس بات کی دعا ہے کہ ہماری شریعت اس قسم کے اصر و اغلال سے پاک رہے جو پچھلی شریعتوں میں موجود ہیں، اور اس دوسرے ٹکڑے میں ان خارج از استطاعت آزمائشوں سے محفوظ رکھے جانے کی دعا ہے جو اس شریعت کے حقوق ادا کرنے کی راہ میں پیش آسکتی ہیں۔

'وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْلَنَا، وَارْحَمْنَا': اس میں اکٹھی تین چیزوں کی درخواست ہے۔ عفو، مغفرت اور رحم۔ عفو کے معنی چشم پوشی کے بھی ہیں اور معاف کر دینے کے بھی۔ یہاں لفظ دوسرے معنی میں ہے۔ غفر کے معنی ڈھانک دینے کے ہیں، رحم کا مفہوم واضح ہے۔ بندے کا سارا اعتماد بس انھی تینوں چیزوں پر ہونا چاہیے۔ رب کریم کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، گناہوں کو ڈھانک دے اور اپنی رحمت سے نوازے آخرت کا سارا سہارا بس یہی تین چیزیں ہیں۔

'اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ' 'مَوْلٰی' کے معنی مرجع کے ہیں جس کی طرف مشکلات میں رجوع کیا جائے۔ یہ آخر میں مخالفین اسلام کے مقابل میں مدد و نصرت کی دعا ہے۔ اس لیے کہ سمع و طاعت کا یہ بارِ گراں امت نے ایسے حالات میں اٹھایا ہے جب کہ دوسرے، جیسا کہ پچھلی تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے، اس بار کو نہ صرف اپنے کندھوں سے پھینک چکے تھے بلکہ اس بنا پر مسلمانوں کے جانی دشمن بھی بن گئے تھے کہ انھوں نے ان کے پھینکے ہوئے اس بوجھ کو سنبھال کیوں لیا۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں لکھنے کی اس گنہگار اور بے مایہ کو توفیق نصیب ہوئی۔
وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔